قلعہ گولکنڈہ، حیدرآباد، دکن سے ماہانہ ادبی مجلّہ..................

انوار تحقیق

جلد۔۲ شمارہ۔۱ جنوری ۲۰۱۶ء

زرتعاون:۔ فی شمارہ:۔۵۰ روپئے سالانہ:۔۵۰۰ روپئے

نگراں:۔ **سید عادل احمد**، محکمہ آثار قدیمہ، اسٹیٹ میوزیم، حیدرآباد، تلنگانہ

ایڈیٹر:۔**سید الیاس احمد مدنی**

پتہ:۔ 9/10/389، نیم باولی مسجد، کٹھورا ہاؤس، گولکنڈہ قلعہ، حیدرآباد، تلنگانہ۔008 500

موبایل نمبر:۔09966647580 ای میل:۔anwaretahqeeq@gmail.com

مجلس ادارت

ڈاکٹر شاہد نوخیز اعظمی۔شعبۂ فارسی، مانو حیدرآباد

ڈاکٹر محمد عقیل۔شعبہ فارسی، بی ایچ یو، وارانسی

ڈاکٹر سکینہ امتیاز خان۔صدر شعبہ فارسی، بمبئی یونیورسٹی، ممبئی

ڈاکٹر محمد قمر عالم۔شعبۂ فارسی، اے ایم یو، علی گڑھ

محمد توصیف خان کاکر۔شعبۂ فارسی، اے ایم یو۔علی گڑھ

احمد نوید یاسر ازلان حیدر

مدیر سہ ماہی ادبی جریدہ ''دبیر''۔کاکوری، لکھنؤ

ارمان احمد

مدیر سہ ماہی ادبی جریدہ ''عرفان''۔چھپرا، بہار

عاطفہ جمال

مدیر سالنامہ ''کوکب ناہید'' سندیلہ، ہردوئی

شیخ عبدالرحیم۔جماعت اسلامی ہند۔حیدرآباد، دکن

متھی علی خان۔نامہ نگار روزنامہ منصف، حیدرآباد، دکن

مجلس مشاورت

پروفیسر شمیم اختر، شعبہ فارسی، بی ایچ یو، بنارس

پروفیسر مسعود انور علوی۔شعبہ عربی اے ایم یو، علی گڑھ

پروفیسر عمر کمال الدین۔شعبۂ فارسی لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ

پروفیسر سید حسن عباس۔شعبۂ فارسی، بی ایچ یو، وارانسی

پروفیسر عزیز بانو۔شعبہ فارسی، مانو حیدرآباد

پی انورادھا ریڈی۔انٹیک، تلنگانہ اسٹیٹ، حیدرآباد۔چاپٹر

ڈاکٹر زرینہ پروین۔ڈائرکٹر آف آرکائیوز، حیدرآباد، دکن

ڈاکٹر سید محمد اصغر عابدی، شعبہ فارسی، اے ایم یو، علی گڑھ

احمد علی، کیپر مینسکر پٹ۔سالار جنگ میوزیم، حیدرآباد

ڈاکٹر سیدہ عصمت جہاں۔شعبۂ فارسی، مانو حیدرآباد

ڈاکٹر ایم اے نعیم، حیدرآباد، دکن

جناب ایم اے غفار، استاد خطاطی، ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد

کشور جھن جھن والا، ماہر مسکوکات، ممبئی

امر بیر سنگھ۔ماہر مسکوکات۔حیدرآباد

فہرست مندرجات

	عنوان	مقالہ نگار	صفحہ
۱۔	اداریہ	مدیر	3
۲۔	خوشہ چیین خرمن اقبال: امجد غزنوی	ڈاکٹر فخر عالم اعظمی	4
۳۔	نقوش مبارک پور	ڈاکٹر شاہد نوخیز اعظمی	10
۳۔	نظم ''پاگل کوے'' سلام سندیلوی کا نوحہ زیست	احمد نوید یاسر ازلان حیدر	14
۴۔	ہاف بوٹل بلڈ	احمد رشید	18
۵۔	شیخ یٰسین جھونسوی حیات اور کارنامے	ارمان احمد	24
۶۔	حالی کی نظم نگاری انجمن پنجاب کے حوالے سے	سید محمد ظفر اقبال	27
۷۔	حالی بحیثیت سوانح نگار	ناظرہ اسحٰق	30
۸۔	تفتہ اور ان کے فارسی کلام کا ایک مختصر جائزہ	شاکرہ طلعت	34
۹۔	حضرت مجدد الف ثانی بحیثیت مدبر و مفکر دین وملت	صحام محیط	39
۱۰۔	علامہ اقبال کی شاعری پند ونصائح کی آئینہ دار	عاطفہ جمال	44
۱۱۔	حضرت نظام الدین اولیاء اور امیر خسرو	ظہیر عباس	47
۱۲۔	خانم فروغ فرخزاد شخصیت و فارسی آثار	منیش کمار	51
۱۳۔	شبلی نعمانی بحیثیت تنقید نگار	مکھن دین	54
۱۴۔	کرشن چندر کے افسانے اور ان کا فن	ٹیکر وموریا	59
۱۵۔	خیر المجالس میں فارسی ادب	یاسر عباس	69
۱۶۔	مغل شہزادیوں کی فارسی ادب سے دلچسپی	محمد مبارک حسین	73

اداریہ

اللہ رب العزت نے اس آدم خاکی کی تمام کوتاہیوں کے باوجود اسے اشرف المخلوقات کا شرف بخشا۔ہماری ہر سانس اس کا احسان ادا کرے تو بھی نہ ادا ہو سکے۔اس کے احسان وکرم کا یہ بھی ایک عجب نمونہ ہے کہ مجھ جیسا حقیر فیض علم سے بہرور ہو کر آج کچھ لکھ سکنے کے قابل ہوا اور فیض علم کو دوسروں تک پہنچانے کے لائق بھی ہو سکا۔ہماری تمام کوتاہیوں کا مجموعہ یہ مجلّہ ''انوار تحقیق'' اپنی ایک جلد مکمل کر کے دوسرے اشاعتی سال میں داخل ہوا۔پہلی جلد کے تمام شمارے بہ فضل الٰہی ناقدین وماہرین فن کی نظروں سے گذر کر داد وتحسین حاصل کر چکے ہیں۔

دوسری جلد کے اس اولین شمارے میں جو مقالہ شائع ہو رہے ہیں ان کی اہمیت وافادیت سے قارئین خود واقف ہو جائیں گے۔ہماری کوشش رہی ہے کہ ہم اپنے اس مجلّہ میں ایسے مقالے شائع کر سکیں جو اپنی جہت کے اعتبار سے کچھ نیا پن لئے ہوئے ہوں اسی لئے ہم نے برائے اشاعت اساتذہ اور طلباء میں کوئی امتیاز نہ رکھا ہے۔اور شاید یہی راہ ہمارے لئے ترقی اور بلندی کا باعث بنے۔ہم اپنے تمام قارئین کرام سے اس دعا کیلئے ملتجی ہیں کہ علم وادب کی خدمت تادم آخر کرتے رہیں۔

وفیات:

سال ۲۰۱۶ء فارسی زبان وادبیات کے لئے ایک ایسا سانحہ لے کر آیا جس کی تلافی شاید ہی ممکن ہو۔سال کے اسی مہینے یعنی جنوری میں بنارس ہندو یونیورسٹی کے شعبہ فارسی کی صدر، **پروفیسر شمیم اختر صاحبہ** کا انتقال ہو گیا۔علم وادب کے اس بحر بیکراں نے جہاں ایک طرف فارسی ادبیات کے لئے کئی اہم کارنامے یادگار چھوڑے وہیں کئی پروجیکٹ تقریباً تکمیل تک پہنچا چکی تھیں مگر شاید بارگاہ ایزدی سے ان کے لئے اتنا حکم ملا تھا۔ان کے کارناموں میں سب سے اہم اور معرکۃ الآراء کارنامہ ''شیخ علی حزیں: حیات وکارنامے'' حزیں جیسی شخصیت مایہ ناز شخصیت پر ہندوستان میں اردو زبان میں یہ پہلی تصنیف کا شرف رکھتی ہے۔اس کے علاوہ اوراق پریشاں، قصائد خاقانی جیسی کئی اہم کتب کی ایک طویل فہرست بھی ہے۔ان کی گوناگوں خدمات کے لئے گزشتہ سال ہی انہیں صدر جمہوریہ اعزاز سے بھی نوازا گیا تھا۔تمام قارئین کرام سے ان کی مغفرت کی درخواست ہے۔مرحومہ کی شبیہ اس آسان سے شعر کی دقیق عکاسی کرتی ہوئی ذہن میں ہمیشہ یادگار رہے گی:

مجھ پہ تحقیق مرے بعد کرے گی دنیا
مجھ کو سمجھیں گے مرے بعد زمانہ والے

(مدیر)

خوشہ چینِ خرمنِ اقبال: امجد غزنوی

ڈاکٹر فخر عالم اعظمی، اسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اردو، خواجہ معین الدین چشتی اردو عربی فارسی یونیورسٹی، لکھنؤ

پروفیسر آلِ احمد سرور کا خیال ہے کہ امجد علی غزنوی کے اشعار میں اقبال اور اقبال سہیل دونوں کے فکر وفن کا پرتو ہے (تعارف ''صہبائے خودی'' از امجد غزنوی) اس قول کی روشنی میں امجد غزنوی کے کلام کا مطالعہ قاری کو اس نتیجے تک پہنچتا ہے کہ امجد نے اپنے استاذ علامہ اقبال سہیل سے کہیں زیادہ اقبال کا اثر قبول کیا ہے۔ امجد کی شاعری کا قابل ذکر حصہ اس حقیقت کا احساس دلاتا ہے کہ ان کے نزدیک اقبال کی حیثیت استاذ معنوی کی ہے۔ امجد غزنوی کی شاعری میں اقبال کی وہی حیثیت ہے جو اقبال کی شاعری میں مولانا روم کو حاصل ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ امجد غزنوی نے اقبال کے وسیلے سے مولانا رومی کے اثرات کو قبول کیا ہے۔ اقبال پر رومی کا سب سے گہرا اثر ان کے نظریہ تصوف اور فلسفۂ عمل کا پڑا۔ رومی کی شخصیت اور شاعری میں تصوف اور عزم وعمل ایک دوسرے میں ضم ہوگئے ہیں۔ اقبال رومی کے فلسفۂ حرکت وعمل کی طرف بیتابانہ کھنچے چلے جاتے ہیں اور اس باب الداخلہ سے ان کی بارگاہِ فکر وفن میں داخل ہوتے ہیں جہاں رومی کے وجودی تصوف کا نشہ ان پر طاری ہوجاتا ہے۔ چوں کہ امجد غزنوی پر اقبال کے وجودی تصوف کا گہرا اثر ہے، لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے قبال کے اشعار کی روانی میں ان کے نظریۂ وحدت الوجود کی وضاحت کردی جائے۔

ابتدا میں علامہ اقبال تصوف کے سخت مخالف تھے۔ علامہ سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں انھوں نے تصوف کو ''سرزمین اسلام میں ایک اجنبی پودا'' کہا تھا اور اس مسئلے کو سراسر رہبانیت قرار دیتے ہوئے ایک حدیث ''ویظهر فيها السمن'' کا حوالہ دیا تھا۔ اتنا ہی نہیں انھوں نے وحدت الوجود کو بدھ مت کے اثرات کا نتیجہ بتایا تھا۔ علاوہ ازیں ''فلسفہ عجم'' میں بھی ایک جگہ فرماتے ہیں:

''ہندو زائرین نے جوان بدھ مندروں کو جایا کرتے تھے جو اس وقت ''باکو'' میں موجود تھے منصور کو بالکل وحدت الجودی بنادیا تھا اور ایک سچے ہندو کی طرح 'اناالحق'' (اہم برہماسمی) چلا اٹھا۔ (فلسفہ عجم، اردو ترجمہ میر حسن الدین حیدرآباد دکن ۱۹۵۱) لیکن بعد کو اقبال شدت کے وجودی فلسفے کے قائل ہوگئے اور اپنے اشعار میں صاف طور پر اپنا روحانی پیشوا قرار دیا۔ فرماتے ہیں:

دگر از شنکر و منصور کم وگئی
خدارا ہم براہِ خویشتن جوئی
بہ خود گم بہرتحقیقِ خودی شو
اناالحق گوی و صدیقِ خودی شو

یعنی اب شنکر ومنصور کا تذکرہ کم کرو اور خدا اپنے وجود کے اندر خدا کو تلاش کرو۔ اپنے اندر اتر کر خودی کی حقیقت معلوم کرو۔ اناالحق کی صدا بلند کرو اور صدیقِ خودی کہلاؤ۔ اقبال ''ارمغانِ حجاز'' میں اناالحق کے زیر عنوان فرماتے ہیں:

اناالحق جز مقامِ کبریا نیست
سزائے او چلیپا ہست یا نیست
اگر فردی بگوید سرزنش بہ
اگر قومی بگوید ناروا نیست

یعنی اناالحق مقامِ کبریا کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ اب رہا سوال یہ کہ اناالحق کا نعرہ بلند کرنے والا سولی کا حق دار ہے یا نہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر اناالحق کا نعرہ فرد واحد لگاتا ہے تو وہ سزا کا مستحق ہے لیکن پوری قم نعرۂ اناالحق بلند کرے تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

اس طرح کے بہت سے اشعار سے علامہ اقبال کے آخری دور کا کلام بھرا پڑا ہے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ بعد میں وحدت الوجود کے زبردست داعی اور مبلغ بن گئے ۔''خطباتِ مدراس'' میں انھوں نے اس نظریے کو نہایت شرح وبسط کے ساتھ پیش کیا ہے جہاں ان کا وحدت الوجود ویدانت سے اس قدر مخلوط ہو گیا ہے کہ دونوں میں تمیز مشکل ہے۔''پیامِ مشرق'' میں کہتے ہیں:

من از بود و بنودِ خود خموشم
اگر گویم کہ ہستم خود پرستم
ولیکن ایں نوائے سادۂ کیست
کسی در سینہ می گوید کہ ہستم

یعنی میں اپنے ''ہونے'' اور نہ ہونے کے بارے میں کیا کہوں؟ لہٰذا خاموش رہنا ہی بہتر ہے۔ کیوں کہ اگر میں کہوں کہ ''ہوں'' تو یہ خود پرستی ہوگی لیکن میرے سینے سے یہ کس کی نوائے سادہ آ رہی ہے۔ یہ کون ہے جو سینے کے اندر کہہ رہا ہے کہ ''میں ہوں''

انتہا یہ ہے کہ اقبال اس مقام پر پہنچ گئے ہیں جہاں انسان خدا سے الگ کوئی وجود نہیں رکھتا۔ فرق ہے تو صرف اتنا کہ ایک ظاہر ہے، دوسرا باطن۔ ایک جزو ہے دوسرا کل۔ انسان اگر خدا کو تلاش کرے گا تو خود اپنے آپ ہی کو پائے گا۔ خدا کوئی ماورائے کائنات حقیقت نہیں ہے بلکہ وہ اسی کائنات موجود ہے۔ یہاں تک اقبال محمدؐ کو خاکی نہیں نوری مانتے ہیں۔ وہ اپنے روحانی استاذ حلاج سے اس ضمن میں سوال کرتے ہیں، تو وہ کہتا ہے:

کسی ز سر عبدۂ آگاہ نیست
عبدۂ جز سرِ الااللہ نیست
لاالہ تیغ و دم اور عبدۂ
فاش تر خواہی بگوہو عبدۂ

یعنی عبدۂ (محمدؐ) کے راز سے کوئی آگاہ نہیں ہے۔ عبدۂ ایک راز اللہ سے کوئی آگاہ نہیں ہے۔ عبدۂ ایک راز الا اللہ کے سوا کچھ ہیں۔ لاالہ تلوار ہے اور عبدۂ اس کی دھار ہے بلکہ صاف الفاظ میں یوں کہنا چاہیے کہ ''ہوٗ'' (اللہ) ہی عبدۂ (محمدؐ) ہے۔

تفصیلات میں جانے کا یہ محل نہیں لیکن جس نظریے کی وضاحت مقصود ہے اس کی شہادت وثبوت کے یہ اشعار کافی ہیں۔ یہی وہ پسندیدہ رخ ہے جو امجد کو بھا گیا۔ اقبال کے عین مطابق امجد کے کلام میں بھی وحدت الوجود کا رنگ بہت گہرا ہے۔ امجد کے نزدیک بھی انسان روحانی سفر کی آخری منزل پر خدا سے ہم آغوش ہو جاتا ہے اور حادث کا وجود قدیم میں ضم ہو جاتا ہے۔ یہاں تک فنا کے بعد ذات مطلق صورت میں بقا حاصل کر لیتا ہے۔ امجد فرماتے ہیں:

سطح دریائے تجلی پر ہوں مانند حباب
ٹوٹ جاتا ہوں تو پھر اس میں سما جاتا ہوں میں
جب کبھی ان کے کسی جلوے سے ٹکراتا ہوں میں
خود تجلی خود تجلی گاہ بن جاتا ہوں میں

یعنی انسان کا وجود اپنی کوئی علاحدہ حیثیت نہیں رکھتا۔ وہ ایک حباب ہے جو دریا ہی کا حصہ ہے۔ وہ چند لمحے کے لیے ایک جھلک دکھا کر فنا نہیں ہوتا بلکہ دریا ہی کا جزو بن کر بقائے دوام حاصل کر لیتا ہے۔ اس کا وجود دریا (ذاتِ مطلق) کے ساتھ ہے اور رہے گا۔ یعنی ذاتِ مطلق ہی کا ایک جزو ہونے کے باعث انسان کو ازلی اور ابدی حیثیت حاصل ہے۔ دوسرے شعر میں بھی یہی تصور کارفرما ہے۔ جلوے سے ٹکرا ایک علاحدہ وجود پر تو دلالت کرتا ہے لیکن قطرے ہی کی طرح یہ بھی ''کل'' ہی کا ایک حصہ ہے جو بہ ظاہر دم بھر کے لیے اپنے مستقر سے بچھڑا اور جلوۂ حقیقت سے ٹکراتے ہی اس میں سرایت

کر گیا۔ جلوہ اور جلوہ گاہ کی دوئی گویا فریبِ نظر تھی ورنہ حقیقت میں دونوں ایک تھے جیسا کہ انجام سے ظاہر ہوا۔ اسی قبیل کا ایک مطلع اور ملاحظہ ہو:

اب امتیاز جلوہ گہ و جلوہ گر کہاں
میری نظر میں پردۂ شمس و قمر کہاں

یہ شعر بھی وحدت الوجود کا انتہائی تصور ہے۔ یعنی اگر نورِ مطلق کو جلوہ گر اور شمس وقمر کو جلوہ تسلیم کرلیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ گو کہ شمس وقمر نورِ مطلق ہی کے عکس سے روشن ہیں لیکن نورِ مطلق اور جلوہ گاہ دو الگ الگ وجود ہیں لہٰذا امجد کی نگاہِ نکتہ رس پردہ بھی اٹھا دیتی ہے اور وجودِ واحد کا ثبوت فراہم کر دیتی ہے۔ اس سلسلے کو مزید دو اشعار دیکھیے:

☆مٹا ہے داغِ ہستی جب مرے آئینۂ دل سے
تو یہ آئینہ خود آئینہ گر معلوم ہوتا ہے
☆پردہ اٹھا دوئی کا تو محسوس یہ ہوا
آئینہ ساز و آئینہ بیں خود ہمیں رہے

داغِ ہستی مٹا دینا نہایت مستحسن عمل ہے جو ایک عارف کی شان ہے لیکن آئینۂ دل سے داغِ ہستی مٹ جانے اور تطہیر قبل کے ذریعے کثافت وجود انسانی اس طرح مٹ گئی کہ آئینہ اور آئینہ گر دونوں ایک ہو گئے۔ دونوں میں کوئی فرق و امتیاز باقی نہ رہا۔ یہ صورتِ حال وحدت الوجود کی معراج ہے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ وجودی اور غیر وجودی دونوں ایک ہی آیت کی روشنی میں ایک دوسرے پر شرک کا الزام عائد کرتے ہیں۔ وجودی مکتبِ فکر کے مخالفین کہتے ہیں کہ جب قدیم کا کوئی کفو نہیں ہے تو حادث کو اس کا جزو قرار دینا شرک ہے جب کہ وجودی نظریے کے حامیوں کا استدلال ہے کہ چوں کہ ماسوائے ذاتِ مطلق کوئی وجود ہی نہیں ہے جو کچھ ہے وہ ذاتِ مطلق ہی کا جزو ہے لہٰذا حادث کو قدیم سے الگ وجود قرار دینا شرک فی الوجود مطلق ہے۔ یہی سبب ہے کہ وجودیوں کا فلسفۂ وحدت ساری کائنات کو وجودِ حقیقی ہی کا جلوہ قرار دیتا ہے۔ کائنات کے کسی جز کو علاحدہ وجود قرار دینا دوئی ہے، جو شرک ہے۔ لہٰذا امجد غزنوی دوسرے شعر میں دوئی کا پردہ اٹھا کر آئینہ ساز (خدا) اور آئینہ بیں (انسان) کو اکائی میں سمو دیتے ہیں۔ درجِ ذیل شعر بھی اس تصور پر مبنی ہے:

کہاں پہ کیجیے سجدہ کہ بن گئی امجؔد
جبینِ شوق مری سنگِ آستاں ان کا

یہ وحدت الوجود کا انتہائی تصور ہے۔ جہاں رکوع و سجود ایک رسمی چیز ہو کر رہ جاتے ہیں۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ اقبال ہی کی طرح امجؔد کے یہاں بھی فکری تضاد پایا جاتا ہے۔ امجؔد کا یہ شعر دیکھیے:

سر جھکا اور حسن کی اک دلربا تصویر دیکھ
آنکھ اٹھا اور عشق کا اک حسن عالمگیریت دیکھ

اس شعر میں وہ سرِ نیاز جھکانے والے ایک حسنِ عالمگیر کے دیدار کی بشارت دیتے ہیں۔ لیکن یہاں انھوں نے اپنا مسلک بدل دیا اور عدم سجود کی یہ توجیہ کہ جب آستانۂ ناز جبین نیاز کی شکل اختیار کر گیا ہے تو اب سرِ نیاز کہاں جھکایا جائے۔ اقبال اور امجد دونوں راہِ سلوک طے کرتے ہوئے شریعت سے آگے بڑھ کر حقیقت کی تلاش میں وحدت الوجود تک آ پہنچے اور فیصلہ کرلیا کہ جس خدا کی تلاش میں مسجد و مندر کی خاک چھانی وہ اپنی ذات ہی کے اندر موجود ہے۔ اب اسے فکری تضاد کہہ لیجیے یا ذہنی ارتقا۔ اقبال نے ''کسی در سینۂ می گوید کہ ہستم'' کہا تو امجد نے اس مضمون کو اس طرح نظم کیا ہے:

اک شمع فروزاں ہے اک شعلۂ رقصاں ہے
اس پیکر خاکی میں یہ کون خراماں ہے

یعنی یہ پیکرتو خا کی ہے اس میں رقص ورفتار کی تب وتاب کہاں ۔ وہ تو اک شمع فروزاں اور اک شعلۂ رقصاں (حسن لم یزل) ہے جو اس پیکر خا کی میں سرایت کیے ہوئے ہے ۔اپنے معنوی استاذ علامہ اقبال ہی کی طرح امجد غزنوی نے بھی اناالحق کو نہ صرف برحق کہاں بلکہ اسے عین ایمان قرار دیا۔نعرۂ اناالحق ان کے نزدیک ایمان کا وہ معیار ہے جس کے بغیر معرفت کی تکمیل ممکن نہیں ۔فرماتے ہیں:

دیارِ عشق میں اس کو کبھی آتے نہیں دیتے
اناالحق کہہ کے بھی جو صاحبِ ایماں نہیں ہوتا

امجد غزنوی کی چشمِ بصیرت پاسبانِ کعبہ اور شیخ حرم کو معرفت کے اسرار ورموز اور عرفان وآ گہی سے نابلد دیکھتی ہے ۔ایسے لوگوں کے ہاتھ میں زمامِ اقتدار واختیار دینے کے وہ مخالف ہیں ۔ چناں چہ کہتے ہیں:

بے خطا بادہ کشوں کی گردنیں کٹنے لگیں
پاسبانِ کعبہ جب سے پیرِ میخانہ ہوا

ان کا خیال ہے کہ منصور جیسے عارف باللہ اور دانائے راز کا قتل انھیں کم نظر علما کی ناعاقبت اندیشی کا نتیجہ ہے ۔ میخانۂ معرفت پر ایسے لوگوں کا تسلط وتصرف معصوم اولیاء اللہ کی گردن زدنی کا موجب ہے ۔وحدت الوجود کے نظریے کے مطابق کفر واسلام کا امتیاز محض کورچشمی وکم نظری کی دلیل ہے ۔ حسن لم یزل اپنی تجلی مقام ومکان کی حدود میں مقید نہیں کرتا۔اس کی نورافشانی وضیاباری دیر وحرم میں یکساں طور پر ہوتی ہے ۔ اگر وحدت الوجود کے علم بردار اس نظریے کو عین ایمان قرار دیتے ہیں۔ان کے مطابق یہ نظریہ قرآن وسنت پر مبنی ہے ۔اس کے باوجود وجودی صوفیا کے نزدیک اسلام کو کفر پر فوقیت حاصل ہے نہ حرم کو دیر پر برتری ۔ دونوں میں سے کسی ایک کمتر قرار دینے کا مطلب ان کے نزدیک جلوۂ حقیقی کو کمتر قرار دینا ہے ۔امجد غزنوی نے اپنے اشعار میں ان خیالات کو پوری فکری قوت اور فنی محاسن کے ساتھ پیش کیا ہے ۔ان کا کہنا ہے کہ حرم ودیر کا تذکرہ ضعف ایمانی کی دلیل ہے ۔ان تفرقوں میں وہ لوگ پڑتے ہیں جو بادۂ معرفت کے نشے سے بہرہ ور نہیں ہوتے ۔ان کے نزدیک دیر وحرم راہِ معرفت کے سنگ گراں ہیں ۔ طاہر لا ہوتی اگر دیر وحرم کی آلودگی سے پرفشاں ہو جائے تو مقام فنافی اللہ تک پرواز سہل تر ہو جائے ۔امجد کا خیال ہے کہ اہلِ دیر وحرم بھی روح دیر وحرم سے ناواقف ہیں ۔ دیر وحرم کی معراج یہ ہے کہ دونوں میکدۂ سلوک میں آ کر ہم آغوش ہو جائیں ۔ اتنا ہی جب امجد شرابِ معرفت نوش کر لیتے ہیں تو بت خانہ انھیں کعبہ نظر آنے لگتا ہے ۔ان کے نزدیک جنت وجہنم کی کوئی حقیقت نہیں کیوں کہ انسان خود جلوۂ طور ہے ۔درجِ ذیل اشعار انھیں خیالات پر مبنی ہیں:

☆شوق مے بادہ پرستوں میں جو کم ہوتا ہے
دیر کا ذکر کہیں ذکر حرم ہوتا ہے
☆یہ کیا بات ہے جو درِ میکدہ پر
ہم آغوش دیر و حرم دیکھتے ہیں
☆عشق سے لبریز جس کے دل کا پیمانہ ہوا
اس کا سنگِ رہ نہ یہ کعبہ نہ میخانہ ہوا
☆یہ سب فریب ہے اے فطرتِ جبیں سائی
وگر نہ در ہے کہیں اور نہ آستانہ ہے
☆شور ناقوس و موذن کی اذاں سے بے خبر
کعبۂ دل کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہوں میں
☆میکدۂ وجود میں دیکھ لیا کوئی نہیں

اب تو نقاب رخ اٹھا میں کوئی اجنبی نہیں
☆شعلہ ٔ طور بن گیا ہے دل
جب نظر سے نظر ملائی ہے
☆وفور شوق میں یہ کیا دکھائی دیتا ہے
صنم کدہ مجھے کعبہ دکھائی دیتا ہے
☆جب آنکھیں بند کیں اک نور کا عالم نظر آیا
اس عالم سے خود اپنا ہی تماشا دیکھ کر نکلے
☆سرمست ہے اور مخمور ہے جو خود اپنے آپ سے دور ہے جو
اک شعلہ ٔ برق طور ہے جو وہ دوزخ و جنت کیا جانے

وحدت الوجود کا ایک اہم مسئلہ فلسفۂ زمان ومکاں بھی ہے۔ یہ تصور ہندوستان میں زمانۂ قدیم سے موجود ہے۔مہاتما بدھ کی تعلیمات میں بھی اس کی صراحت ملتی ہے۔ ہندو مذہب میں یہ فلسفہ بدھ ہی سے آیا۔بعض علما کا خیال ہے کہ اس کا ذکر اپنشدوں میں بھی ہے لیکن اتنی بات تو طے ہے کہ یہ فلسفہ ہندوستان میں پہلے سے موجود تھا۔اقبال چوں کہ وجودی نظریے کے قائل تھے۔اس لیے فلسفہٗ زمان ومکاں ان کی دل چسپی کا باعث بنا اور چوں کہ ہر موجود شے خدا کی مظہر ہے۔لہٰذا جب سے کائنات وجود میں آئی ہے اور جب تک باقی رہے گی،ایک مطلق وجود پر دلالت کرے گی۔ازل سے ابد تک جو روز وشب کا سلسلہ ہے اس کی کوئی حقیقت نہیں۔یہ شب وروز وجود مطلق کے مظاہر ہیں۔اقبال کہتے ہیں کہ ذات (خدا) انھیں سے اپنی قبائے صفات بناتی ہے۔اس کا الگ سے کوئی وجود نہیں۔وجود صرف وجود مطلق ہے جس کو اقبال نے ''نہ ہے زماں نہ مکاں لا الہ الاللہ'' کہا۔یعنی صاحب بصیرت زمان ومکاں کی زناریوں میں نہیں الجھتا۔امجد غزنوی بھی اپنی نگاہِ شوق وتجسس سے شب وروز کا طلسم توڑتے ہیں:

میری نگاہ شوق و تجسس کے روبرو ☆ ٹوٹا طلسم پردۂ لیل و نہار کا
مثال کوہِ تمکیں ہر قدم حائل رہے امجد ☆ مری راہ طلب میں یہ زماں اور یہ مکاں برسوں
یہ آدمی جو قید زمان و مکاں میں ہے ☆ ہم نے اسے نجات کے نکتے بتائے ہیں

وحدت الوجود کے مسائل میں ایک مسئلہ اشیا کی تسبیح خوانی سے متعلق بھی ہے۔قرآن کریم کی آیت ہے۔

وجودی صوفیا نے اشیا کی تسبیح سے تسبیح قولی مراد لی ہے اور غیر وجودی صوفیا نے تسبیح حالی وجودی صوفیا نے متعدد آیات واحادیث سے تسبیح قولی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے لیکن بہ خوف طوالت انھیں قلم انداز کیا جاتا ہے۔تسبیح حالی کے موافقین میں امام رازی کا نام سب سے نمایاں ہے۔اردو مفسرین قرآن میں اشرف علی تھانوی،ابوالکلام آزاد اور ابوالاعلیٰ مودودی نے تسبیح حالی مراد لی ہے۔غیر وجودیوں نے بغیر تاویل کے تسبیح حالی مراد لی ہے کیوں کہ جب خود خدائے تعالیٰ نے لا تفقھون کہہ دیا تو تاویل شاید مناسب نہ ہو لیکن امجد غزنوی چوں کہ وجودی ہیں لہٰذا وہ تسبیح قولی مراد لیتے ہیں۔ان کے نزدیک ایک صاحبِ بصیرت انسان سے یہ راز مخفی نہیں ہے:

زہے گوش وہ کہ جو سن سکے زہے چشم وہ کہ جو دیکھ لے
وہ جو ساز شاخ و شجر میں ہے وہ جو راز پردۂ در میں ہے

جیسا کہ اس سے قبل مذکور ہوا کہ فلسفۂ وحدت الوجود کی رو سے انسان اور خدا دو علاحدہ اجزا نہیں ہیں۔خدا ''کل'' ہے اور انسان اس کا ''جزو'' اول الذکر قدیم ہے اور ثانی الذکر محدث۔کائنات کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ قدیم اور محدث جدا ہو گئے تو ایک خدا کہلایا اور دوسرا کائنات۔اب دونوں پھر ایک دوسرے میں ضم ہونے کے لیے بے قرار ہیں۔اقبال کہتے ہیں:

☆قدیم و محدث از ہم چوں جدا شد
کہ آیں عالم شد آں دیگر خدا شد
☆اگر معروف و عارف ذات پاک است
چہ سودا در سر ِ ایں خاک است

یعنی قدیم اور محدث جب ایک دوسرے سے جدا ہو گئے تو ایک عالم کہلایا اور دوسرا خدا۔ اگر معرفت و عارف دونوں خدا ہی کی ذات ہے تو پھر انسان کے سر میں کس کا سودا ہے۔ امجد غزنوی بھی چوں کہ راہِ تصوف میں اقبال کے مقلد ہیں لہٰذا انھیں بھی تخلیق عالم ایک تماشا نظر آتی ہے۔ ''خلق السموات والارض'' انھیں یہ سوال کرنے پر مجبور کرتا ہے کہ خدا نے یہ دعویٰ کیا کہ اس نے زمین و آسماں کیوں پیدا کیے۔ امجد نے یہ سوال اس لیے کیا کہ وجودی تصوف خدا کو خالق اور کائنات کو مخلوق نہیں مانتا۔ اس کے نزدیک کائنات حسن ازل ہی کا ایک عکس ہے۔ لہٰذا تخلیق کائنات امجد کے ذہن میں یہ سوال پیدا کرتی ہے کہ جب کائنات جلوۂ حقیقی کا پرتو ہے تو جب سے خدا موجود ہے۔ کائنات بھی موجود ہوگی۔ پھر کائنات کی تخلیق کیا معنی رکھتی ہے۔ جب مومن و کافر دونوں کے اندر جمال خداوندی موجود ہے۔ گبر و مسلماں دونوں ایمانی حالت پر یکساں ہیں تو نزول وحی اور بعثت رسول کا سبب آخر کیا ہے۔ ابن مریم کا مردوں کو زندہ کرنا چہ معنی دارد۔ جب ہر شے میں انوارِ الٰہی موجود ہے تو حضرت یونس کا شکم ماہی میں اعتراف گناہ کیا حقیقت رکھتا ہے۔ جب ہر انسان عکس حسن لم یزل ہے تو عصائے موسیٰ کی سحر سامری پر فتح یابی کا تذکرہ کیوں ہے۔ فرماتے ہیں:

ہے تیری ذات کا سایہ یہ کائنات اگر
تو پھر یہ دعویٰ ارض و سما گری کیا ہے
یہ فرق کعبہ و میخانہ و کلیسا کیا
نزدل وحی و پیام و پیمبری کیا ہے
حقیقت دم ِ عیسی و ماہی ِ یونس
عصائے موسوی و سحر سامری کیا ہے

مذکورہ بالا اشعار مولانا روم اور علامہ اقبال کی تقلید کا سچا نمونہ ہے۔ یہ وہی شرابِ شوق ہے جسے نوشِ جاں کر کے مولانا روم منصب سلوک پر متمکن نظر آتے ہیں۔ یہی وہ بادۂ ہوش افزا ہے جو اقبال کو اسرارِ کائنات کا آئینہ ادراک عطا کرتی ہے۔ یہی وہی صہبائے جنوں انگیز ہے جس کا نشہ امجد غزنوی پر عرفان و آگہی کے دریچے وا کرتا ہے۔ فلسفۂ وحدت الوجود کے مخالفین اسے خواہ کتنا ہی گم راہ کن کیوں نہ قرار دیں لیکن شاعری میں یہ عین ایمان ہے۔ غالب اور جگر جیسے بادہ نوش و مے پرست شاعر بھی شاعری میں کائنات کے اسرار و رموز کے محرم ہیں۔ علامہ شبلی رقم طراز ہیں:

''یہ مسئلہ صوفیانہ شاعری کی روح رواں ہے۔ صوفیانہ شاعری میں جو ذوق، شوق، سوز و گداز، جوش و خروش زور و اثر ہے۔ سب اسی بادۂ مرد افگن کا فیض ہے۔ وحدت وجود کا مسئلہ سرتاپا شاعری ہے۔ ہر چیز خدا ہے، تمام عالم اس کے اشکالِ گونا گوں ہیں۔ ایک ہستی مطلق عام بھی ہے، خاص بھی، مطلق بھی، مقید بھی۔ کلی بھی، جزئی بھی۔ جو ہر بھی ہے عرض بھی، سیاہ بھی ہے سفید بھی۔ اس سے بڑھ کر شاعری اور کیا ہوسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمثیل نے اس مضمون میں اس قدر عمل کیا کہ چھ سو برس سے اس بات کو کہتے آئے ہیں پھر بھی نہ بات ختم ہوتی ہے نہ اس کی دل آویزی میں کمی ہوتی ہے۔ ہزاروں پہلو سے یہ مضمون ادا ہو چکا ہے۔ پھر بھی نئے نئے پیرائے نکلتے آتے ہیں۔ (شعر العجم، حصہ پنجم صف ۲۳۱)

امجد غزنوی نے بھی اسی آب سے خنجر ابروئے غزل کو چمکایا۔ یہی شرابِ فکر رومی اور اقبال کے جام میں بھی موجزن تھی اور یہی صہبائے تخیل امجد غزنوی کے ساغر اسلوب میں نہایت انوکھے، اچھوتے اور منفرد رنگ میں رقص کناں ہے۔

☆☆☆

نقوش مبارکپور

ڈاکٹر شاہد نوخیز اعظمی، ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ فارسی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

اعظم گڑھ شیراز ہند دیار مشرق کا ایک مردم خیز ضلع ہے جسکے بیشتر قریہ و قصبات علم و فن سے مالا مال ہیں جن میں ماہل، بندول، جیراجپور، چریا کوٹ، کوریا پار، نظام آباد، قاضی کی سرائے، قابل ذکر ہیں، انہیں قصبات میں ایک مشہور نام مبارکپور کا بھی ہے جہاں بے شمار علمی شخصیات پیدا ہوئی ہیں۔

مبارکپور، ضلع اعظم گڑھ کا ایک قدیم مشہور معروف، مردم خیز اور صنعتی قصبہ ہے، یہ ضلع اعظم گڑھ سے مشرق میں ۱۵ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے اس وقت اس کی آبادی تقریباً ۱۳۵۰۰۰ (ایک لاکھ پینتیس ہزار) ہے جسمیں مسلم آبادی قریب ۸۰ فیصد ہے اس کا رقبہ ۹ مربع کلومیٹر ہے۔

یہاں اسلام کب پھیلا؟ مسلمانوں کا عمل دخل کب سے شروع ہوا؟ اس کا نام مبارکپور کیوں پڑا؟ اس ضمن میں بیان کیا جاتا ہے کہ سلطان محمود غزنوی (متوفی ۴۲۱ھ ۱۰۳۰ء) کے ہمراہ ہندوستان میں جو فوج آئی تھی اس میں سید مسعود سالار غازی بھی تھے، غازی موصوف نے کچھ لشکر لیکر مشرقی اتر پردیش کا رخ کیا وہ خود تو بہرائچ چلے گئے اور انکے کچھ سپاہی اعظم گڑھ کی طرف چلے آئے، ان سپاہیوں میں ملک شدنی نام کے ایک سپاہی بھی تھے، وہ اپنے چند ہمراہیوں کے ساتھ مبارکپور میں وارد ہوئے، اس وقت اس آبادی کا نام 'قاسم آباد' تھا، قاضی اطہر مبارکپوری ''تذکرہ علمائے مبارکپور'' کے صفحہ ۶۲ پر رقمطراز ہیں کہ:۔

''ہماری تحقیق میں ملک شدنیؒ یہاں کے قدیم ترین بزرگوں میں سے ہیں، جو پانچویں صدی میں مسعود سالار غازیؒ نے زمانہ میں بسلسلہ جہاد شہید ہوئے، آپ کا مزار مبارکپور کے شمال مشرق میں چند فرلانگ پر سریاں نامی بستی سے متصل شمال میں ایک پر فضا باغ میں تالاب کے پاس واقع ہے اور اسی سے متصل مغرب میں ملک شدنی موضع آباد ہے۔''

ملک شدنی کے مزار کے علاوہ مبارکپور کے اطراف میں کئی مزارات ایسے ہیں جنکے بارے میں ظن غالب ہے کہ مسعود سالار غازی کے ہمراہیوں کے ہیں، چنانچہ قصبہ کے جنوب میں سمودی تالاب پر ایک قبر ہے ''جونو غازی پیر'' کے نام سے مشہور ہے قصبہ کے مشرق میں ایک انہادر نام کی بستی ہے۔ اسمیں دو مزارات ہیں ایک کو سیکھندی شہید اور دوسرے کو امرتے شہید کہتے ہیں جو اصل میں شیخ ہندی شہید اور عمر شہید ہیں۔ قصبہ کے جنوب میں ایک مزار ہے جسے ''شہید بابا'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اعظم گڑھ اور مبارکپور کے بیچ موضع محبت پور اور موضعہ روضہ محلیا میں بھی کئی گنج شہیداں ہیں۔ اس کے علاوہ کئی شہید واڑے ہیں مگر انکی تاریخ بالکل مجہول ہے۔ اسی زمانے سے اس قصبہ میں مسلمانوں کی تعداد دن بدن بڑھتی گئی۔ اور جلد ہی یہ قصبہ مسلم اکثریت کی آبادی والا قصبہ بن گیا۔

یہ قصبہ عہد غزنوی سے عہد ہمایوں تک زوال و انحطاط سے کافی دوچار ہونے کے بعد سلطان محمد نصیر الدین ہمایوں کے زمانہ میں ازسرنو حضرت راجہ سید مبارک شاہ قصبہ مانک پور ضلع پرتاب گڑھ (متوفی ۲ شوال ۹۶۵ھ) سے اسکی موجودہ آبادی کی بنیاد پڑی۔ آپکا سلسلہء نسب یہ ہے۔ حضرت راجہ سید مبارک بن راجہ سید احمد بن راجہ سید نور بن راجہ سید حامد شاہ بن راجہ عزالدین بن شہاب الدین ثانی بن حسام الدین بن شہاب الدین بن زین الدین بن امام محمد باقر بن امام جعفر صادقؒ۔ چونکہ راجہ سید مبارک شاہ اس کے بانی ہیں اس لئے یہ قصبہ آپ ہی کے نام منسوب ہوکر مبارکپور کے نام سے مشہور ہوا۔

آپ سے منسوب قصبہ میں ایک مسجد راجہ مبارک شاہ ہے۔ راجہ صاحب کا قیام اسی مسجد سے متصل تھا، یہ ایک طویل و عریض مسجد ہے، بلاشبہ یہ مسجد اہل مبارکپور کے دلوں کی دھڑکن ہے، ماضی قریب میں یہ قصبہ کی واحد جامع مسجد تھی، لیکن آبادی میں اضافہ کے سبب دوسری جامع مسجد ناگزیر ہوگئی۔ لہٰذا اب کئی جامع مسجدیں بن گئی ہیں۔ پھر بھی اہل مبارکپور کا ہر فرد اس پر دل و جان سے قربان ہے۔ عطا مبارکپوری ''بہار رحمت'' کے صفحہ ۳۲ لکھتے ہیں

کہ:۔

عظمت قصبہ مبارکپور کی روشن دلیل ۔۔۔ جامع مسجد ہے مبارک شاہ کی بے قال و قیل
پختگی و رفعت و وسعت کی شہہ کار جمیل ۔۔۔ مشرقی یورپ میں جورکھتی نہیں اپنا مثیل
بو الحامد اشرفی نے رکھی بنیاد جدید ۔۔۔ ہے اسی بنیاد کی تعمیر نوروشن دلیل
رونق این مسجد جامع ازین گرد و فزون ۔۔۔ آیت قرآن کہ مکتوب است در آن بر فصیل
ہر کہ شرکت کرد در تعمیر بالخصوص ۔۔۔ بالیقین گویم کہ آن یابد ز حق اجر بفر سیل

بہر این مسجد سلطان خون دلہا ریختند
لائق صد آفرین اہل مبارکپور اند ۲

عہد ماضی میں اس قصبہ پرغزنوی سلاطین سے مغل سلاطین تک نیزنوابان اودھ کا عمل دخل رہاہے،جس کا ثبوت یہ ہے کہ قصبہ اور قصبہ کے قرب وجوار کی بہت سی قو میں،مواضع،عمارتیں اورتالاب ان بادشاہوں یاان صوبہ داروں کے نام سے منسوب ہیں۔مغل شہنشاہ عالمگیر کی بنوائی ہوئی گجھڑا میں ۱۰۹۹ھ کی ایک شاندار مسجد ہے۔۱۲۰۹ھ میں نواب شجاع الدولہ نے ایک امام باڑہ بنوایا جواب''مکان'' کے نام مشہور ہے، نیز قصبہ واطراف قصبہ میں بہت سے امام باڑے اور روضے مسلم سلاطین کی نشانیاں ہیں۔۱۰،نومبر ۱۸۰۱ء مطابق ۲،رجب ۱۲۱۶ھ میں یہ قصبہ برطانیہ حکومت کے زیرنگیں ہوگیا۔ یہ تھامبارکپور کامختصر تاریخی پس منظر۔

معاشی اوراقتصادی اعتبار سے قصبہ کافی ترقی پزیر ہے، یہاں کی خاص صنعت پارچہ بافی ہے، بیڈروم پرمختلف قسم کے نہایت عمدہ کپڑے خاص کرریشمی ساڑیاں تیار کی جاتی ہیں۔جو بنارسی ساڑی کے نام سے مشہور ہیں یہاں کی تیارشدہ ساڑیاں پورے ہندوستان اور بیرون ہندبھیجی جاتی ہیں، یہ یہاں کا بہت قدیم پیشہ ہے،عہدتغلق میں جبکہ کٹرامانکپورمرکز تھا،اس زمانے میں کٹرامانکپوراوراسکے ماتحت علاقوں کے بارے میں مشہورمغربی سیاح ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ

''ان علاقوں میں نہایت عمدہ قسم کے کپڑے تیار کئے جاتے ہیں اور یہاں سے اٹھارہ دن کی مسافت پر دہلی بھیجے جاتے ہیں۔'' (بحوالہ ''تذکرہ علمائے مبارک پورصفحہ۱۷)

سلطان محمد بن تغلق کے دور میں صرف شاہی کارخانوں میں ۴ہزار پارچہ باف، ریشمی اوردوسرے اقسام کے کپڑے تیارکرتے تھے،اس کے سوا سوسال بعدراجہ سیدمبارک شاہ کٹرامانکپور سے تشریف لائے اور یہاں کے بعض خاندان کو یہاں لاکر بسایاان لوگوں نے پارچہ بافی شروع کردی۔ حاصل کلام یہ ہیکہ مبارکپور کے وجود کےساتھ ساتھ یہاں پارچہ بافی کا بھی وجود ہوا۔اس صنعت میں بلاامتیاز مذہب وملت سب لوگ شامل ہیں،اوریہی وجہ ہے کہ ہندومسلمان ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں،مبارکپور ہندومسلم کے میل ملاپ کا ایک سنگم ہے،اورساتھ ہی ساتھ ہرشخص انتہائی خوش وخرم نظرآتا ہے۔

یہ قصبہ اپنی معاشی اوراقتصادی ترقی کےساتھ علم وفضل،سیاست وحکمت اورشعروادب کے میدان میں بھی انفرادی حیثیت کا حاصل ہے، یہ امرمتفق علیہ ہے کہ مسلمان روزی روٹی کے ساتھ ہمیشہ تعلیم کی طرف بھی دھیان دیتے ہیں کیونکہ بانی اسلام حضرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا ہے کہ طلب العلم فریضۃ علی ومسلمہ۔اور بیشک مسلمان کا مصداق نظرآتا ہے۔مولانا ابوالحسنات ندوی''ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں'' میں صفحہ۱۱پر رقمطراز ہیں کہ:۔

''وہ جس وقت عرب سے نکلے تھےان کے ایک ہاتھ میں فتح ونصرت کی تلواراوردوسرے میں علم وفن کا چراغ تھا، جوملک ان کے زیرنگیں آیا وہاں انہوں نےفضل وکمال کی بزم چراغاں برپا کردی۔وہ عرب کی سرزمین سے نکلےاور دنیا کے جنوب وشمال شرق ومغرب میں پھیل گئے۔ان کا پھیلنا

ساری دنیا کیلئے مبارک تھا۔ جہاں پہنچے وہاں کے زمین وآسان کو بدل دیا، اندلس کی زین میں تہذیب وتدن کی روشنی پھیلائی کہ مغرب کاظلمت کدہ روشن ہوا، مصر، طرابلس، الجزائر، مراکش، اور قیروان کے افریقی وحشیوں کو تعلیم دے کر فضل وکمال کی معراج پر پہنچا یا دیا، ایران کو مشرق میں علوم وفنون کا سرچشمہ بنادیا۔ اندلس کا اسلامی تمدن، ایران میں شیراز وبغداد کی اسلامی تعلیم گاہیں آج تک انکی قومی تاریخ کے زریں کارنامے ہیں اور ابدالاباد رہیں گے۔''[۴]

قصبہ مبارکپور تعلیم کے میدان میں ہمیشہ آگے رہا ہے، شروع شروع میں یہاں گھروں پر ہی تعلیم کا عام رواج تھا پھر مسجدوں میں تعلیم کا رواج ہوا، بعدہٗ مستقل طور پر مدرسوں کا وجود ہوا، اس وقت قصبہ میں حسب ذیل مدارس چل رہے ہیں:۔

۱۔ مدرسہ باب العلم:۔ عہد شجاع الدولہ میں ۱۲۰۹ھ میں رمضان علی شاہ نے ایک امام باڑہ بنایا جو بعد میں مکان کے نام سے مشہور ہوا۔ اس میں بہت بڑا مدرسہ تھا، جسمیں باہر کے کئی مدرس تھے مثلاً مولوی نثار علی سرائے میری، مولوی نشان اور میر معظم حسین۔ یہی امام باڑہ ۱۸۱۳ء کی جنگ میں مسلمانوں کا قلعہ بند تھا، یہ تینوں حضرات جنگ میں داد وشجاعت دیتے ہوئے کوچ کر گئے، یہی امام باڑہ والا مدرسہ آج تک باب العلم کے نام سے جاری ہے۔ یہاں دور دراز کے طلبہ آتے ہیں یہ مدرسہ شیعہ جماعت کے زیر تصرف چل رہا ہے۔

۲۔ مدرسہ دار التعلیم:۔ ۱۳۱۳ھ بمطابق ۱۸۹۴ء میں قصبہ کے لوگوں نے مولانا عبدالرحمٰن صاحب محدث کی قیادت میں ایک مدرسہ قائم کیا وہی اسکے پہلے مدرس تھے، مگر کچھ دنوں بعد حنفی اور غیر مقلد کا اختلاف پیدا ہو گیا، اور حنفی لوگ اس سے علیحدہ ہو گئے، یہ مدرسہ آج بھی اچھی حالت میں چل رہا ہے اور اہل حدیث مکتب خیال کا ترجمان ہے۔

۳۔ مدرسہ احیاء العلوم:۔ ۱۳۱۷ھ بمطابق ۱۸۹۹ء میں احناف نے ایک مدرسہ مصباح العلوم کے نام سے جاری کیا، جس کے مدرس اول مولانا محمد محمود صاحب (متوفی ۱۳۷۰ھ) اور مدرس دوم مولانا محمد صدیق صاحب گھوسوی تھے۔ مگر کچھ دنوں بعد دیو بندی اور غیر دیو بندوی کا اختلاف پڑا اور مولانا محمد صدیق صاحب مدرسہ کو پرانی بستی میں لے گئے اور اس مدرسہ کا نام مصباح العلوم ہی رکھا اور پرانے مدرسہ کا احیاء العلوم پڑا جو آج بھی اپنی جگہ پر دیو بندی نظریہ پر جاری ہے۔

۴۔ دار العلوم اشرفیہ مصباح العلوم مبارکپور:۔ احناف میں اختلاف کے بعد ۱۳۲۶ھ (۱۹۰۷ء) میں محلّہ پرانی بستی میں مصباح العلوم کا قیام عمل آیا، اور مولا محمد صدیق صاحب حسب سابق درس دینے لگے، شروع میں یہ ایک چھوٹا سا مکتب تھا، اس زمانہ میں شیخ المشائخ حضرت مولانا سید شاہ علی حسین اشرفی (اشرفی میاں)ؒ کچھوچھہ شریف اسکے سرپرست اور صدر الشریعہ حضرت مولانا امجد علی صاحب اسکے مربی تھے، مدرسین کی تقرری آپ ہی کیا کرتے تھے مذکورہ بالا اداروں کے علاوہ سریاں، رسولپور، نوادہ، املو، حسین آباد میں بہت ہی کامیابی کے ساتھ مدارس چل رہے ہیں اور بلا شبہ مبارکپور سے عربی وفارسی کا عظیم سرچشمہ پھوٹ رہا ہے، جس سے پورا عالم سیراب ہو رہا ہے۔

قدیم جدید تعلیم کے معاملہ میں یہ قصبہ راہ ترقی پر گامزن ہے، یہاں دینی اور عربی مدارس کے علاوہ انگریزی ادارے بھی چھوٹے بڑے اور قدیم وجدید خاصی تعداد موجود ہیں، لڑکوں کے ساتھ لڑکیوں کی تعلیم کا رواج عام ہو رہا ہے، اس مقصد کے تحت کئی نسواں ادارے قائم کئے گئے ہیں اور مزید کئی ادارے قائم ہو رہے ہیں، نسواں ادارے دو طرح کے ہیں جن میں کچھ دینی تعلیم کیلئے مختص ہیں اور کچھ علوم جدیدہ کیلئے مخصوص ہیں۔ دور حاضر کی ضرورت کے مطابق متعدد پبلک اسکول بھی قائم ہوئے ہیں اور نسواں ڈگری کالج قائم ہو چکا ہے۔ قاضی اطہر مبارکپوری اور مولانا ظفر حسن عینیؔ کا تعلق بھی اسی مشہور قصبہ سے ہے۔ یہ خطہ ہمیشہ سے علم وادب کا مرکز رہا ہے، یہاں کی مردم خیز زمین نے ایک سے بڑھ کر ایک دانشور، مفکر مدبر ادیب اور شاعر پیدا کئے ہیں، یہاں کی خاک سے اٹھنے والے ذرۂ بے مقدار افق ادب پر آفتاب وماہتاب بن کر چمکتے رہے ہیں، اس سرزمین پر جب علم وادب کے پر کیف جھونکے مست خرامی میں مصروف ہوتے ہیں تو انکے دوش پر پرواز کرتے ہوئے ذرہ شہرۂ آفاق پر جا پہنچتے ہیں اور اپنے پرتو فیض سے ایک عالم بسیط کو رخشندہ کرتے ہیں، ایک زمانہ تھا کہ یہ قصبہ عطاؔ، شفاؔ، غلام حسین خاکیؔ، حبیب اللہ حبیبؔ، علی حسن حسنؔ، افتخار احمد رہبرؔ، اور منشی سہد یورام کیفؔ، کا مسکن تھا۔ پھر اس کے بعد یہی قصبہ ارشاد احمد جوہرؔ، قاضی اطہرؔ، مولانا عبدالحمید ناظرؔ، نذیر احمد فرازؔ، ڈاکٹر محسن ادیبیؔ، مولانا عثمان ساحرؔ، قمر الزماں زماںؔ، منظور احمد

منظورؔ، اور ظہیر احمد مضطرؔ کا وطن عزیز بنا۔ اسی سرزمین میں مولانا خلیل گوہرؔ، ایوب مبارک پوری، شررؔ مصباحی، حماد مبارکپوری محمد احمد کوثرؔ، حافظ محمد عمرؔ اور غلام مصطفیٰ ہاشمی نے اپنی سخن فہمیوں اور سخن سازیوں کا جادو بکھیرا، گویا مبارکپور عطاؔ، شفاؔ، اور خاکیؔ سے لیکر آج تک گہوارۂ شعر ادب بنا ہوا ہے۔

ماضی بعید میں منشی سہد یورام کیفؔ کا ''کیفیات کیف'' جب منظر ادبیات پر منکشف ہوا تو مبارک پور کے نیم ادبی ماحول میں ایک کیف پیدا ہو گیا، ایک سرور، ایک مستی کی فضا بن گئی، اور یہ کیفیت مبارکپور کے عوام وخواص، ادبی وغیرادبی لوگوں کے رگ وپے میں اس حد تک سرایت کر گئی کہ لوگ اسی میں گم ہوتے چلے گئے اور پھر دھیرے دھیرے ''کیفیات کیف'' کی کیفیت ماند پڑنے لگی تو نذیر احمد فرازؔ کے ذہن جدید میں یہ خیال آیا کہ کہیں یہ ادبی تحریک پیچھے نہ رہ جائے، پھر کیا تھا انہوں نے ادب شناس لوگوں کے دست ذوق میں ''حرارتیں'' تھما دی۔ ادب کی رگوں کے منجمد خون میں ایک حرارت پیدا ہوگئی، مبارکپور کے اہل ادب، ادب کی دکھتی ہوئی نبض پر انگشت مسیحا کا لمس محسوس کرنے لگے۔ مبارکپور کی مسموم اور سرد فضا میں ایک سکون بخش گرمی، ایک پر کیف حرارت نے لوگوں کو بڑی حد تک مائل بہ مشق سخن کر دیا۔ اس طرح شش جہاتی طور پر ایک ادبی فضا قائم ہوگئی، فراز صاحب نے ہمیں ''حرارتیں'' دے کر ایک عظیم کارنامہ انجام دیا ہے۔

شررؔ مصباحی نے مبارکپور کے متعدد شعراء کی تخلیق کائنات کو بڑی جاں فشانی سے یکجا کر کے ''نمود سحر'' کے نام سے شائع کیا۔ یہ ان کا احسان ہے کہ انہوں نے زبان اردو کے ادبی سرمائے میں ایک بیش بہا شے کا اضافہ کیا اور ساتھ ہی ساتھ انہوں نے قصبہ مبارکپور کے ادبی شاہکاروں کی ایک شناخت قائم کر دی۔

مولانا خلیل گوہرؔ کا نام قابل ذکر ہے، ان کی ذات لائق تحسین ومبارکپور باد ہے کہ انہوں نے اپنی نعتیہ شاعری کو ''سامان آخرت'' کی شکل میں شائع کر کے اپنے اور اپنے متعلقین بلکہ جتنے لوگ حضور انور ﷺ کی ذات اقدس سے عقیدت رکھنے والے ہیں، سبھی کے لئے آخرت کا سامان فراہم کر دیا اور انشاءاللہ گوہرؔ صاحب کو ''سامان آخرت'' کے صدقے حیات جاودانی نصیب ہوگئی اور ہمیشہ یاد کئے جائیں گے۔

اس طرح مجموعی اعتبار سے دیکھا جائے تو مبارک پور کا ادبی کینوس مزید وسیع ہو رہا ہے، اب مسلہ ہے مبارکپور کے ادبی سرمائے کے تحفظ اور شناخت اسی بنیاد پر ہوسکتا ہے کہ اب تک جو انتخابات کلام اور کتابچے شائع ہوئے ہیں ان کو دوباری شائع کیا جائے اور اس کے علاوہ مبارکپور کے جو شاعر و ادیب گمنانی کی تاریکیوں میں بھٹک رہے ہیں، جن کی تخلیقات بے دست بردہ زمانہ کے ہاتھ برباد ہوگئی ہیں، جنکی آوازیں دنیا کی ہنگامہ آرائیوں میں گم ہو گئی ہیں، ان گم شدہ ہستیوں پر ادبی فیچر قائم کئے جائیں، انکی ادبی خدمات کو منظر عام پر لایا جائے، انکے ادبی فنی ثقافتی اور لسانی کارناموں کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کرائی جائے تاکہ مبارکپور کے ادبی سرمائے کا عملی طور پر تحفظ ہو سکے اور عوام تک انکی پہنچ کو آسان بنایا جا سکے اس سلسلہ میں تمام شعراء، ادباء، مصنفین، اور دیگر لوگوں کی مخلصانہ تعاون کی ضرورت ہے تاکہ یہ تمام کوششیں کامیابی کی منزلوں سے ہمکنار ہو سکیں۔

☆☆☆

نظم ''پاگل کوّے'' سلام سندیلوی کا نوحۂ زیست

احمد نوید یاسر ازلان حیدر، مدیر سہ ماہی دبیر، دبیر حسن میموریل لائبریری، کاکوری، لکھنؤ

پیپل میں اے سلامؔ یہ جکڑا ہوا پتنگ ... سمجھا رہا ہے زیست کی گہرائیوں کا راز
ٹوٹے گا ایک دن یونہی ٹکرا کے موت سے ... انسان کی حیات کا چلتا ہوا جہاز

پروفیسر سلامؔ سندیلوی اردو زبان وادب کی ان مایاں ناز ہستیوں میں گنے جاتے ہیں، جنہوں اس عظیم واعلی و بلند مرتبہ زبان کی خدمت کے لئے اپنی زندگی وقف کردی، سلامؔ صاحب کا آبائی وطن ضلع ہردوئی کا مردم خیز خطہ سندیلہ سے متصل ایک گاؤں ''کرنہ'' ہے، سلام صاحب نے صغرسنی میں ہی تعلیم کی غرض سے وطن کو خیرآباد کہہ دیا پہلے سندیلہ پھر سرزمین پیدائش اردو مسکن شام اودھ لکھنؤ کو زینت بخشی، اور یہیں سے ان پر مایوسی وغم کا دورِ دوراں شروع ہوگیا، ۱۹۴۶ء میں والد ماجد کا انتقال ہوگیا، ابھی اسی دورغم میں گھرے تھے، کہ چچا، ماموں اور سوتیلوں بھائیوں نے انکی ملکیت ہڑپ کر لی اب انکے پاس والدہ ماجدہ کے علاوہ کوئی قابل قدر اثاثہ نہ تھا، مگر شاید قدرت کو یہ بھی نہ منظور تھا اور ستمبر ۱۹۴۷ء کو وہ بھی اس دنیا کو خیرآباد کہہ گئیں نیز یہ کہ محرومی وحشت اور اکیلے پن کے پہاڑ یکے بعد دیگرے انکی نازک اندام ہستی پر گرنے شروع ہوگئے، والدہ کے غم کے ساتھ ساتھ قدرت نے ایک حسین دل کو سکون بخشنے والے کھلونے بیٹی نذہت شہوار سے نوازا، اسکی اوٹ پٹانگ حرکتوں اور توتلی آواز نے سلامؔ صاحب کے دل کو ابھی ڈھنگ سے بہلایا بھی نہ تھا کہ وہ بھی جدا ہوگئی، سب سے بڑا المیہ جو انکی زندگی میں ہوا وہ رفیق حیات سے بچھڑ جانے کا، ۱۳ اپریل ۱۹۴۸ء کو انکی باعصمت وباعزت رفیق حیات انہیں اس تنہائی کے عالم میں چھوڑ کر اس دنیا سے ہنوز ۲۲ سال کی عمر میں چلی گئیں، اب کیا تھا تنہائی اور غم کے بادل انکی زندگی پر ایسے سایہ فگن ہوئے جنکی قید سے وہ زندگی بھر نہ نکل سکے، سلامؔ صاحب کی اس غم واندوہ سے بھرپور زندگی کا حال خود انکے ہی الفاظ میں ملاحظہ ہو:۔

''میری زندگی آنسو ہی آنسو ہے، جسمیں تبسم ہائے پنہاں کی بھی جھلک نہیں، بچپن کا زمانہ بھی زیادہ خوشی سے نہیں گذرا، خصوصاً تعلیم کے سلسلہ میں جب والدین سے جدا ہونا پڑا، تو پردیس کے مصائب نے تندرستی خراب کردی، اور جب شباب کی نیند آنا شروع ہوئی تو سیہ بختی نے یکایک چونکا دیا، مصیبتیں یکے بعد دیگرے بھیس بدل بدل کر زندگی کے سکون کو برباد کرتی رہیں، ۳۱، دسمبر ۱۹۴۶ء کو جب میں شباب کی منزل طئے کر رہا تھا، اچانک والد ماجد کا انتقال ہوگیا اور سر پر رنج وغم کا ایک پہاڑ ٹوٹ پڑا، ناتجربہ کار سمجھ کر اپنوں نے بیگانگی برتی، چچا نے کچھ زمین و باغات ہڑپ کر لئے، ماموں نے قدیمی مکان پر دانت جمائے، سوتیلے بھائی نے جوروستم کا تختۂ مشق بنا ڈالا، پھر بھی غنیمت کے دن تھے کہ والدہ ماجدہ تسکین قلب کے لئے موجود تھیں، مگر خدا کو یہ بھی منظور نہ تھا، انکی آنکھ میں درد اٹھا اور موتیا بند کا مرض ہوگیا، چنانچہ ۹، ستمبر ۱۹۴۷ء کو انہوں نے بھی داعی اجل کو لبیک کہا، اب میں تھا اور میری مایوسیاں میری پھوٹی ہوئی قسمت تھی اور اور ظلمتیں، بے پناہ ظلمتیں جہاں سنہری کرن کا گذر نہیں، قدرت نے بہت مغموم دیکھ کر جولائی ۱۹۴۷ء کو ایک حسین کھلونا دل بہلانے کو دیا مگر پھر نہ جانے کیوں چھین لیا، نذہت شہوار امید کی نئی کلی، چار ماہ کی مسکراہٹ کے بعد مرجھا گئی، اب پھر میری دنیا میں اندھیرا چھا گیا، اور زندگی کی تمام آرزوئیں فنا ہوگئیں، لیکن ابھی قدرت کو مجھے اور بھی مجبور کرنا تھا ۳، اپریل ۱۹۴۸ء کو ۷ بجے شام کے قریب ایک بجلی گری جس نے میرے خرمن ہستی کو پھونک ڈالا، میری رفیقۂ حیات صرف ۲۲ سال کی عمر میں مجھ سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ گئی، اتنے زخم کھانے کے بعد خبر نہیں میں پاگل کیوں نہ ہوگیا، یا اب تک کیسے زندہ ہوں، اب اگر کوئی مونس وغمخوار ہے تو گیارہ سالہ بہن۔'' (ساغرو مینا صفحہ ۸۔۹)

محترم سلامؔ سندیلوی نے جس انداز میں یہ واقعات بیان فرمائے ہیں انمیں ایک درد ایک ٹیس غم و بے بسی کے آثار اس انداز میں پنہاں ہیں کہ قاری پر رقعت طاری ہو جائے، سلام صاحب نے بے بس کر دینے والے میں اگر کسی کو اپنا دوست بنایا تو کتابیں اگر کسی کہیں آنسوں بہائے تو دفتروں پر اور اگر کہیں اپنی داستان بیان کی تو اپنی شاعری میں۔ سلام صاحب کا زمانۂ شاعری بدلاؤ کا زمانہ ہر جگہ تحریکات کا اثر تھا تو شاعری پر کیوں نہ ہوتا شاعری

میں الگ الگ خانوادے بن گئے کہیں عشقیہ غزلیں، کہیں پرمسرت نظمیں، کہیں غم و مایوسی بھری شاعری، تو کہیں ملت وقوم کی اصلاحی شاعری۔ سلام صاحب شاعری کے اس خانوادے سے تعلق رکھتے تھے جو پرانی لکیر کو پیٹنے والی جماعت بھی نہ تھی اور ادب کی عزت بھی وافتخار کو برقرار رکھنے والی بھی تھی، ویسے تو زیادہ تر سلام صاحب کی شاعری میں غم واندوہ کا اثر ہی نظر آتا ہے مگر کہیں کہیں پر وہ اتنے شوخ ہوجاتے ہیں کہ قاری یہ سمجھنے سے قاصر رہتا ہے کہ کیا یہ وہی سلام ہیں، مثلاً ''اے عمر ذرا آہستہ چل'' یہ بند ملاحظہ ہو:۔

آخر اتنی جلدی کیا ہے، کچھ دیکھ تو دلکش نظارے
میٹھے چشمے ٹھنڈے دریا، اونچے ٹیلے، بہتے دھارے
شبنم میں کوثر کی موجیں، ذروں میں جنت کے تارے
کومل کرنوں کی گردن میں، یہ بانہیں ڈالے جمنا جل
اے عمر ذرا آہستہ چل

سلام صاحب کی تمام زندگی غم وآلام سے گھری ہوئی تھی، اور اسی لئے انکی شاعری گم کی نمایاں عکاس بن گئی، مگر اسمیں بھی جو صداقت وخلوص ہے وہ ہر شعر سے ظاہر ہوجاتا ہے، شاعری کے علامہ اقبال مرحوم نے جو صداقت پر مبنی بات کہی ہے کہ ''دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے'' یہ ہر شاعر پر کم وبیش لاگو ہوتی ہے کیونکہ شاعر اپنے ماحول کی پیداوار ہوتا ہے اور اگر ماحول کے عناصر کو وہ اپنے اوپر یا شاعری پر حاوی نہیں ہونے دیتا تو اسکا مطلب صاف ہے کہ وہ کسی غرض کے عوض شاعری کو اپنائے ہوئے ہے، سلام صاحب کے بارے میں احسن فاروقی صاحب کے خیالات کسی قدر صداقت پر مبنی نظر آتے ہیں جو انہوں نے ساغر ومینا کے مقدمہ میں تحریر کئے ہیں:۔

''سلام صاحب کی زندگی کو غم نے اپنالیا ہے، اور سلام صاحب کی زندگی نے غم کو اپنالیا ہے، پھر کیسے ممکن ہے کہ آنسوؤں کی لڑیوں کے بجائے نغمہ ونور کی موجیں صفحہ قرطاس پر بکھر جائیں پھر بھی سلام صاحب کا کلام فراریت کی تلقین نہیں کرتا، بلکہ ٹوٹے ہوئے دلوں کے لئے مومیائی کا اثر رکھتا ہے، ان کی نظم ''ایک پناہ گزیں دوست سے'' کو ملاحظہ فرمایئے، شاعر ایک غمگین پناہ گزین کو اپنی غم آلود حیات کا حوالہ دیکر یوں سمجھاتا ہے:۔

اے ہم نفس خدارا ہواس قدر نہ غمگیں — تو میرا حال سنکر دے اپنے دل کو تسکیں
تیرے لئے نہیں ہے جذ غم کے کوئی چارا — میرا بھی اس جہاں میں کوئی نہیں سہارا
لیکن یہ سوچ کیوں ہم تنگ آئیں زندگی سے — باقی جو رہ گئے دن کاٹیں ہنسی خوشی سے
ہم راز حق کو سمجھیں کب عقل میں سکت ہے — تقدیر جو پھری ہے کوئی تو مصلحت ہے''

سلام سندیلوی صاحب انتہائی ملنسار ووضعدار طبیعت کے حامل تھے، وہ گورکھپور یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے صدر و پروفیسر کے عہدہ پر فائز تھے، اکثر وبیشتر شعری نشستوں میں بھی تشریف لے جاتے تھے اور کلام ایسی لگن سے اور دل کی گہرائیوں سے سناتے کہ سامعین دل پکڑ کر رہ جاتے، انکے آواز واشعار دونوں کو خدائے عزوجل نے یکساں اثر عطا کیا تھا انکے کلام کے جتنے بھی مجموعے شائع ہوئے ہیں ان سب میں منفرد خیالات وفکر موجود ہیں کلام سے محضوض ہونے کے بعد قاری خود بہ خود یہ کہنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ سلام صاحب نظم کے اعلیٰ شاعر تھے، سلام صاحب نے تقریباً شعر کی ہر صنف پر طبع آزمائی کی ہے مگر سب سے زیادہ شہرت انہیں انکی نظم نگاری نے ہی عطا کی۔ اور سلام صاحب سندیلوی کی جو سب سے مشہور ومعروف نظم ہے وہ ''پاگل کوّے'' جو ''ہندوستانی ادب'' دکن میں مدیر کے اس فٹ نوٹ کے ساتھ شائع ہوئی:۔

''پاگل کوّے'' تو کچھ یونہی سا اور بے معنی معلوم ہوتا ہے ممکن ہے کہ محض عنوان کے سبب بہت سے لوگ نظم پڑھنے کی زحمت تک نہ گوارا کریں، اور اگر وہ پڑھ لیں تو انہیں معلوم ہوگا کہ شاعر اپنے ماحول سے کس حد تک متاثر ہے، بات معمولی سی ہے، عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اگر کسی کے گھر کوّا آکر بولے تو عنقریب کوئی مہمان آئیگا جس سے گھر والوں کو خوشی ومسرت ہوگی، ہم مانتے ہیں کہ یہ ایک شگون ہے، مگر دیکھئے اسی شگون کی آڑ میں شاعر

نے کسی کی دکھ بھری زندگی کا کیسا بہتر نقشہ کھینچا ہے.......................میں ہر اردو شاعر کو مشورہ دوں گا کہ وہ گل وبلبل کی فرسودہ شاعری کو ترک کر دے اور سلاؔم سندیلوی کی طرح اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کو ملکی اور حقیقی شاعری میں صرف کریں۔''

پاگل کوّے مت بول یہاں ہے کون یہاں آنے والا
مجھ سے تو خفا ہے سارا جہاں، ہے کون یہاں آنے والا
میری دیوار پہ تو بیٹھا ،کیوں پاپی شور مچاتا ہے
کیوں بھولی بسری باتوں کو، پردیس میں یاد دلاتا ہے
کیوں کانوں کو جھٹلاتا ہے،کیوں نظروں کو بہکاتا ہے
میرا دنیا میں کوئی نہیں، کس کا سندیس سناتا ہے
جا چھیڑ نہ دکھتی رگ ناداں، ہے کون یہاں آنے والا
پاگل کوّے مت بول یہاں، ہے کون یہاں آنے والا

سلام سندیلوی کی نظم ''پاگل کوّے'' کے لئے مدیر ''ہمایوں'' کے یہ الفاظ بھی ملاحظہ ہوں:۔

''آپ نے جن ماہناموں کا ذکر کیا ہے وہ بدقسمتی سے ادبی نہیں ہیں، میں نے ہمیشہ یہ کوشش کی ہے کہ ان رسالوں کے ادیبوں کو اپنے یہاں جگہ نہ دوں، مگر آپ کی نظموں میں ایک ایسے شاعر کی جھلک نظر آتی ہے جس میں انفرادیت ہے اس لئے اگر آپ میرا مشورہ قبول کر سکیں تو میں یہ کہوں گا کہ آپ سستی شہرت کے پیچھے پڑ کر اپنی صلاحیتوں کو ختم نہ کریں، مجھے یقین ہے کہ اگر آپ کاوش اور مطالعہ سے کام لیں گے تو بہت جلد اردو کے معیاری ماہنامے آپ کی نظمیں شائع کریں گے۔''

بہکے کوّے سن بات میری،گھبرا کے ڈگر کیا بھول گیا
کچھ غور تو کر، کچھ سوچ تو لے، جلدی میں نگر کیا بھول گیا
جنکے گھر تجھ کو جانا تھا، تو اس کا گھر کیا بھول گیا
کیا نقشہ تجھ کو یاد نہیں، دیوار و در کیا بھول گیا
وہ ہوگا کوئی اور مکاں ، ہے کون یہاں آنے وال
پاگل کوّے مت بول یہاں ہے کون یہاں آنے والا
اک باپ تھا بیلا باغ میں ہے، جو زیر تربت برسوں سے
اک ماں جو گاؤں میں رہتی تھی، ہے ساکن جنت برسوں سے
اک بھائی کہیں پردیس میں ہے، جس سے ہے عداوت برسوں سے
اک دور کا ماموں ہے جسکو، مجھ سے ہے شکایت برسوں سے
پھر کس کے آنے کا ہو گماں ہے کون یہاں آنے والا
پاگل کوّے مت بول یہاں ہے کون یہاں آنے والا

سلام سندیلوی صاحب کی اس نظم پر فراقؔ گورکھپوری کا بھی ملاحظہ ہو:۔

''مکرمی ۔تسلیم ۔آج ۹،اکتوبر ۱۹۴۵ء کو آپ کی نظم ملی، یقین مانئے اسے پڑھ کر اتنا اثر ہوا کہ دل میں میٹھا میٹھا درد ہونے لگا، اس نظم میں مجھے تو کوئی عیب نظر نہیں آیا، خوبیاں ہی خوبیاں نظر آئیں، اگر کہیں آپ اتنے معصوم جذبات اور اتنے معصوم ترنم سے لبریز پچاس ساٹھ نظمیں بھی دو چار برس کے اندر کہہ ڈالیں تو آپ اردو ادب اور ہندوستان پر احسان کریں گے، اس نظم کو گنگناتے ہوئے میں مشکل سے اپنے آنسو روک سکا،............میری طرف

سے اس نظم کے لئے مبارک باد قبول فرمایئے اس نظم کو میں کچھ رسالوں میں بھیجنا چاہتا ہوں، امید کہ آپ کی اجازت ہے...... خیر اندیش فراؔق ۔''

تیری بو سے اۓ پنچھی اک پچھلی چوٹ ابھر آئی
وہ میری زوجہ خوش باطن جو تھی غم خوار تنہائی
جسکی ہر سانس میں بجتی تھی الفت کی سریلی شہنائی
وہ جنت کی جانب چل دی لیتی ہوئی مات کی انگڑائی
خاموش لحد ہے جسکا نشاں ہے کون یہاں آنے والا
پاگل کوّے مت بول یہاں ہے کون یہاں آنے والا
میں دور بہت پردیس میں ہوں میری بہنیں سسرال میں ہیں
برسوں سے خبر ان کی نہ ملی کیا جانے وہ کس حال میں ہیں
آنا چاہیں تو آ نہ سکیں کچھ ایسے وہ جنجال میں ہیں
ان کے شوہر مجھ سے بدظن اور وہ شوہر کے جال میں ہیں
آئے گا کون مرا مہماں ہے کون یہاں آنے والا
پاگل کوّے مت بول یہاں ہے کون یہاں آنے والا

اپنی اس نظم کے بارے میں سلاؔم صاحب سندیلوی یوں لب کشاں ہیں اور اسمیں بھی انکے غمگین ہونے کا عکس نمایاں ہے:۔

''اصل نظم میں نے ۱۹۴۳ء میں والد صاحب کے انتقال کے بعد کہی تھی، مگر شاید نگاہ معشیت میں یہ تصویر نامکمل تھی اور ابھی وہ چند آہوں اور سسکیوں کی اسمیں کمی محسوس کر رہی تھی چنانچہ وہ آہیں اور سسکیاں والدہ مرحومہ اور زوجہ مرحومہ کے انتقال کے بعد شامل ہوگئیں اور اس طرح ۱۹۴۸ء میں یہ غم کی تصویر مکمل ہوگئی۔''

بھولے کوّے خود اپنا چچا ہے مثل بے گانہ دشمن
جو پہلے راز کے محرم تھے اب ہیں وہ در پردہ دشمن
محسوس کبھی یوں ہوتا ہے خود اپنا ہے سایہ دشمن
اس جور و جفا کی دنیا میں ہر ایک ہے القصہ دشمن
ساری دنیا ہے دشمن جاں ہے کون یہاں آنے والا
پاگل کوّے مت بول یہاں ہے کون یہاں آنے والا
جھوٹے کوّے اب اڑ بھی جا یاں آون ہارا کوئی نہیں
اب میں نہ کسی کا پیارا یوں اب میرا پیارا کوئی نہیں
ساتھی ہے سلاؔم اپنا ہی دم بس اور سہارا کوئی نہیں
دریا طوفاں رات اندھیرا اور پاس کنارا کوئی نہیں
منجدھار میں اب کشتی ہے رواں، ہے کون یہاں آنے والا
پاگل کوّے مت بول یہاں ہے کون یہاں آنے والا

☆☆☆

ھاف بوٹل بلڈ

احمد رشید (علیگ)، گلی راحت والا کنواں، سرائے رحمان، علی گڑھ

خون پانی پر بھاری ہوتا ہے جب سر پہ سوار ہوتو قیامت آجائے۔خون کا رشتہ اس سے خونم خون ہو جاتا ہے اگر درمیان میں زن، زر یا زمین آجائے خدائے برتر کی زمین کے ایک مختصر ٹکڑے کے لئے خون کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔طلوعِ آفتاب کی ہلکی سی روشنی نے خواب آور آنکھوں کو خیرہ کیا تو وہ چونک سا گیا اور رات کی تھکن جو اس کی آنکھوں میں پابہ زنجیر ہے رہائی حاصل کرنے کے لئے بے چین ہوگئی۔صبح گاہی سے لطف اندور ہونے کے دوران ایک خون کی لکیر اس کی پیشانی پر ابھر آئی اس نے خمار آلوٗ د آنکھوں کی پلکیں رفتہ رفتہ وا کیں دھوپ کی تیز رفتار شعاعوں کی روشنی سے اس کی آنکھیں چم چما گئیں وہ اٹھ کر چار پائی پر بیٹھ گیا جس کی ادراون ڈھیلی اور بان برگد کی داڑھی کی طرح زمین کو چھو رہے ہیں۔دھوپ کی چادر تقریباً بچھ گئی ہے۔آنگن کے پلاسٹر پر باریک باریک آڑی ترچھی لکیریں معاشی بحران کا شکار یو۔پی کا نقشہ بنا رہی ہیں۔دائیں جانب بچھی چار پائی پر بیوی چت پڑی گہری نیند میں ڈوبی ہوئی یا تھکی ہوئی تھکے ہوئے خواب بن رہی ہے۔خوابوں کا بننا بہت آسان مشغلہ ہے دیکھی بھالی حقیقت کے پس پردہ خواب مستتر ہوتے ہیں کبھی کبھی اس قدر اوٹ پٹانگ ہوتے ہیں کہ حقیقت سے ان کا کوئی میل نہیں کھاتا اگر یاد رہ جائیں تو بغیر منطقی ربط دیئے سنگین زندگی کے حقائق جیسا بیان کرنا مشکل ہوتا ہے۔رات کے پہلے نصف حصے میں ماں نے کہا تھا ''بیٹا سو جا بھوت آجائے گا'' اور سو گیا لو آن دھمکا خواب میں اَن دیکھا بھوت پھر مجال کیا کہ شیطان کی طرح لاحول پڑھنے سے بھی بھاگ جائے ماحول ایسا کر بناک کہ اندھیرے میں دم گھٹنے لگے جوں توں کر کے صبح ہوتی تھی۔

ماتھے پر کئی باریک لکیریں سرخ روشنی میں دمک رہی ہیں۔نیم باز آنکھیں وا ہو چکی ہیں پھر بھی خواب ہے کہ ٹوٹتا نہیں ہے ابھی شادی کو صرف دو سال ہوئے ہیں لیکن اندازہ ہوا شادی شدہ زندگی میں بہت دکھ ہوتے ہیں سب ہی خواب خون ہو گئے۔......مگر غیر شادی شدہ زندگی میں بھی کوئی سکھ نہیں ہوتا علاوہ سنہرے سپنوں کا محل تعمیر کرنے کے۔اس نے بھی ایک خوبصورت محل تعمیر کیا اس میں چاندنی بدن رانی رکھنے کا۔آنگن میں چار پائی پر ایک بے سدھ بدن جو آنکھوں میں داخل ہوکر گدگدی کرتا ہے اور تھکن اوڑھ کر سو جاتا ہے۔اس کی آنکھوں کی روشنی آنچل پر سمٹ گئی ہے۔دھوپ چاروں طرف پھیل گئی ہے اندھیرے میں ہر شے صفر ہو جاتی ہے اب صاف دکھائی دے رہی ہے۔

اس نے اسٹو و جلایا۔سنسناہٹ اور سناٹے کا شور بڑے کمرے کے متصل چھوٹا کمرہ جو باورچی خانہ اور غسل خانہ بھی ہے میں پھیل گیا۔سلور کے فرائی پان میں دو کپ پانی رکھا ہے......کھولن ذہن میں ہونے لگی، پانچ بھائیوں کے بیچ خون بہا کر مختصر حصہ ملا تھا ''کالے سر کی نے حصے بکرے کرا دیئے'' ایسا ماں نے کہا یہ بھول گئی بہو بیٹی بھی ہوتی ہے بہر حال زن کے آنے سے کوئی نیا رشتہ جڑے تو پرانے رشتے خونم خون ہو جاتے ہیں جیسے دروپدی کے لئے خون کے رشتے خونی ہو گئے اور دھرتی پر مہا بھارت وقوع پذیر ہوئی۔

اسٹو و پر رکھا پانی ابھی اُبل رہا ہے چائے کی بھینی بھینی خوشبو میں رات کی تھکن بھاپ بن کر اڑ رہی ہے۔قریب چار پائی پر سوئی ہوئی بیوی نے کروٹ لی۔وہ جسم کا کون سا عضو چھو کر جگائے ہر عضو کے لمس سے وہ لذت آشنا ہے، ہونٹوں پہ آب رواں جیسی سبک لہر آئی اس نے رخسار کی لالی چٹکی میں لی۔بیوی نے سرخی مائل آنکھیں کھول دیں ایک جھما کا روشنی کا داخل ہوا اور آنکھیں نیم باز ہو گئیں۔

''چائے گرم'' یہ عمل اس کے معمول میں شامل ہے۔آفتاب کے گرد زمین کی روزانہ گردش سے شب و روز بنتے ہیں۔صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے اور چائے بھی بنتی ہے۔مرد کی کمزوری بیوی ہوتی ہے یا پھر مفلسی، دونوں صورتوں میں زندگی جینا شتر مرغ کی طرح چونچ کو ریت میں گڑا دینے کی طرح ہے۔دن کی پوری تھکان عورت کے پہلو میں انڈیل کر ناف میں داخل ہونا صحرائے کائنات کو سر سے گزارنا ہے اگر چہ ریگستان میں گرم ریتیلی خاموشی میں

سرسبز نخلستان کا اچانک ملنا روح کا باغ باغ ہونا بھی ہے۔

وہ مسکرائی پیالی ہاتھ میں لی، دو انگلیوں کے لمس کا احساس جاگا ''کب جاگے؟''

''رات کہہ رہی تھی تم کمزور ہوگئے ہو۔ اپنی کمزوری چھپا رہی تھیں ایسے میں نیند بہت آتی ہے'' ایک خوبصورت صحت مند بچہ گرائپ واٹر کے کلینڈر سے جھانک رہا ہے۔

اس نے چکنے پیٹ پر ہاتھ پھیرا۔ دائیں کان کو پیٹ پر رکھا ''ہلو آپ کون بول رہے ہیں؟''

وہ مسکرائی اور بڑے ناز و انداز سے کنکھیوں سے اسے دیکھا۔ حسین اداؤں کے ایسے لمحات مرد کی جان لے لیتے ہیں حالانکہ دنیا کی مادائیں، نروں کے مقابلے میں زیادہ خوبصورت نہیں ہوتیں۔ مور، مرغ، شیر خود مرد اور مرد ہے کہ عورت کے حسن و جمال کے بیان کرنے میں پوری زندگی گزار دیتا ہے پھر بھی عورت مرد کی نہ تو معترف اور نہ ہی احسان مند ہوتی ہے۔

''کیا بول رہا ہے'' پلکوں کے نیچے حیا کے سرخ ڈورے بن گئے۔

''میں ہوں تمہارا خون۔ خون کی کمی کے سبب تمہیں نیند زیادہ آتی ہے۔ اگر اپنی صحت کا خیال رکھو گی تب ہی میرے خون کی حفاظت ہوگی'' اس نے سنجیدگی سے کہا

''ڈاکٹر نے تمہیں بھی انیمیا تشخیص کیا ہے۔ یہ سب خون کی تجارت کا نتیجہ ہے'' سنجیدگی کا دامن پکڑتے ہوئے۔

''ڈاکٹر علاج کم کرتے ہیں، ڈراتے زیادہ ہیں'' اس نے لاپرواہی سے جواب دیتے ہوئے غسل کی تیاری کی۔ انسان زندگی سے بہت پیار کرتا ہے جبکہ زندگی بیوفائی کا نام ہے۔ موت معشوقہ ہے ایک ناقابل قبول ابدی حقیقت۔ یہ سوچ کر خوف کی کپکپی مارچ کی اترتی سردی کی طرح جسم میں اتر گئی بالٹی میں دو انگلیاں ڈالیں خنکی کا احساس کیا پانی کی بالائی سطح پر کپکپی پھیل گئی۔

''نہانے کا صابن نہیں ہے'' بیوی نے اطلاع دی

''صابن کے زیادہ استعمال سے چرم روگ ہو جاتے ہیں'' اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا وہ بے دلی سے مسکرائی۔ مفلسی چھپانے کا یہ ڈھونگ اس وقت کامیاب ہوتا ہے، جب انسان خوش حالی میں یہ دعویٰ کرے ورنہ تنگ دستی ہمیشہ سر پہ چڑھ کر بولتی ہے۔

انیمیا کا خیال آتے ہی، خوف جسم میں سما گیا۔ بچپن سے جوانی تک پانی خون بنتا ہے اور جوانی ڈھلنے کے بعد خون پانی ہونے لگتا ہے......موت سے زیادہ بھیانک عمر کا آخری پڑاؤ میں سب کچھ پانی پانی ہونے لگتا ہے۔ اس نے خوف کو دبانے کے لئے بدن پر پانی اُلیچنا شروع کر دیا۔ چاروں طرف پانی ہی پانی...... پانی......آسمان کے دہانے کھل گئے۔ زمین سے پانی ابلنے لگا......سیارے ٹھٹک کر مشرق سے مغرب کی نور جانب الٹے پاؤں چلنے لگے۔ بے نور تقدیر کے ستارے اِدھر اُدھر بکھرنے لگے۔ پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اڑنے لگے......آسمان کی میخیں اکھڑنے لگیں شعاعیں سمٹ گئیں۔ آفتاب بے نور ہو گیا۔ کاش آسمان تھم جائے، زمین پانی نگل جائے اور زندگی کی کشتی کے لئے کوئی جودی پہاڑ جیسی پناہ گاہ مل جائے۔

''کیوں پانی کو برباد کر رہے ہو۔ پانی خدا کی رحمت بھی ہے اور نعمت بھی'' بیوی نے پانی کی قلّت کی طرف اشارہ کیا

''ہاں زندگی بھی اور ضرورت زندگی بھی'' چونکتے ہوئے کہا

''ڈاکٹر نے متوازن غذا کا مشورہ دیا تھا'' بیوی نے یاد دلانے کی کوشش کی

''آج اسپتال چلیں گے'' اس نے قدرے زور دیا

''ارے وہاں سرکاری اسپتال میں بڑی گندگی ہوتی ہے'' بیوی نے ناک اس طرح سکیڑی جیسے نزلے کا پانی سونت رہی ہو۔ اچانک درد کی شدت سے کراہ اٹھی اور وہ پیٹ کی رسولی کے بارے میں سوچنے لگی۔

''گندگی دیکھیں یا بیماری''

''اندازِ گفتگو استفہامیہ نہیں ہے......طنز کر رہے ہیں آپ''

''الٹے پاؤں چلنے والی زندگی خود ایک طنز ہوتی ہے'' تھوڑی دیر خاموشی طاری رہی

''تمہاری سوچ میں کڑواہٹ ہے اسی لئے میرے استفہام کو طنز سمجھ رہی ہو''

''بات کو الٹ پھیر کر رہے ہیں آپ، یہ گندی بات ہے'' بیوی نے مسکراتے ہوئے کہا

''دراصل گندگی کا زندگی سے اور زندگی کا بیماری سے رشتہ، چولی دامن کا ہے''

وہ سوچتا ہے گندگی ہی گندگی ہے کھیت سے پیٹ تک۔ ماحولیاتی آلودگی کرۂ ارض سے ساوی تک، گر اپنی اصل پر غور کیا جائے تو آدم مٹی سے اور بنی آدم بے قدر نطفہ سے اور نطفہ مٹی سے نکلی ہوئی غذاوں کا خلاصہ ہے جس میں حس و شعور، جلال و جمال کچھ بھی نہ تھا...... مانو زمین مردہ پڑی تھی، رحمت کا پانی پڑتے ہی جی اٹھی، تروتازہ ہو کر لہلانے لگی، انواع واقسام کے خوش منظر، فرحت بخش اور نشاط افزا پودے قدرت نے اگا دیئے، مٹی سے غذا نکالی جس نے کئی منزلیں طے کیں، نطفہ بنا اس طرح قطرۂ آب کی پوشیدہ قوتیں علقہ میں، پھر مضغہ میں مضغہ کے طفیل طِفل میں اور جوانی میں ان کا پورا ظہور ہو گیا۔ اچانک خیال نے فائل کی شکل اختیار کر لی۔

یہاں اسٹور پر فائل رکھی تھی'' اس نے چونک کر کہا اور سرکاری اسپتال میں کھو گیا۔ اسپرٹ اور فنائل کی ملی جلی، بو نتھنوں کے ذریعہ پھیپھڑوں میں داخل ہونے لگی۔ اسپتال کی عمارت کی پشت پر کوڑے کے ڈھیر میں خون اور پیپ سے لتھڑی روئی اور پٹیوں کے درمیان سے گلوکوز کی بوتلیں جھانک رہی تھیں، ڈسپوزل کے انجکشن اور دواؤں کے ریپر چاروں طرف بکھرے پڑے تھے......ہوا کے جھونکے کے ساتھ غلیظ بساند سے اس کی دماغ کی نسیں تن گئیں۔

بیوی نے ادھر ادھر نظریں گھمائیں اسٹور پر رکھے کپڑے الٹ پلٹ کئے۔ فائل کے اِرد گرد عمر کے ماہ و سال اس طرح گزر رہے ہیں جیسے زمین کی سالانہ گردش میں موسموں کے نظام بدلتے ہیں۔ بہار کی تمنا میں جوانی خزاں رسیدہ ہو کر زرد پتیوں کی طرح جھڑ رہی ہے......وہ بڑبڑائی ''فائل نہ ہو مانو جادوئی چراغ ہو''

''ملک کا پورا جمہوری نظام فائلوں میں قید ہے'' اس نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ سڑکوں کا جال، بے روزگاروں کے لئے یوجنائیں، نہروں اور پلوں کی پلاننگ، آلودگی دور کرنے کے پروگرام، مریضوں کی زندگی و موت کا گوشوارہ، فسادات کے کمیشن کی رپورٹیں۔ اس طرح تحریر ہیں جیسے بنی آدم کی تقدیریں لوحِ محفوظ پر مرقوم ہوں۔

''لو فائل مل گئی''

''اس جادوئی چراغ کے پیٹ میں روزی بھری ہوئی ہے'' وہ مسکرایا

''روزی نہیں روزگار چاہئے'' اس نے طنز کیا

''شکریہ......دعا چاہئے'' فائل ہاتھ میں لیتے ہوئے۔ ''چلیں''

''نہیں......م......جھ...... مجھے بہت کام ہے۔ کپڑے بھی دھونے ہیں''

وہ اس جواب کو سننے کا جیسے منتظر تھا ''خدا حافظ'' کہتا ہوا باہر نکل گیا

ادھر ادھر آفسوں کا چکّر۔ اس کا روز کا معمول ہے۔ روزگار گھٹا ٹوپ اندھیرے میں صبح ستارہ کی تلاش جیسا ایک سخت جان عمل ہے۔ دسواں پاس کیا ہل ہاتھ سے چھوٹ گیا اور بی اے کرنے کے باوجود گھر ہاتھ سے چھوٹ رہا ہے۔ صبح نکلنا، تکان سر پہ سوار دیر رات گئے گھر لوٹنا۔ لوٹنا کیا سرائے میں آکر سونا......جاگنا......بھاگنا مانو زندگی زمین کی طرح اپنے محور پر ایک ہی سمت چکّر لگا رہی ہے۔

......وہ سڑک کو اپنی دُھن میں عبور کر رہا تھا۔ آنکھوں پر دُھن کا پردہ تھا، دائیں بائیں چلنے والے لوگ گزر رہے تھے۔ اچانک دُھن کا پردہ

ہٹا......ایک بھیڑ جنازے کے پیچھے نظر آئی۔اس نے سنا

''بلڈ کینسر ہو گیا تھا''ایک شخص کہہ رہا ہے۔

''موت حکم ربی، بہانہ بلڈ کینسر کا''اس نے سوچا

''اللہ الصمد'' دوسرے شخص نے جواب دیا

جنازہ کے پیچھے چلنے والوں میں ایک شخص افسوس اور رنج کا اظہار کرتا ہے

''اپنے اوپر رنج اور افسوس کر۔ ملک الموت،موت کی سختی اور خاتمہ کا خوف ختم۔ یہ تینوں مرحلے تیرے اوپر باقی ہیں'' ساتھ میں چلنے والے ایک دانشور نے کہا

اچانک مرنے والے کا نام جاننے کا خیال آتے ہی، میرے اوپر ایک نامعلوم خوف سا طاری ہو گیا۔اسے یاد آیا بچپن میں سنا تھا یا کہیں پڑھا تھا

''یہ کس کا جنازہ ہے''؟ کسی راستہ چلنے والے نے پوچھا

''یہ تیرا جنازہ ہے اور اگر تجھے یہ بات گراں گزرے تو میرا جنازہ ہے''ایک بزرگ نے فرمایا

اس نے سوچا یہ وقت اپنی موت کو یاد کرنے کا ہے اس وقت فضول بات کی طرف متوجہ ہونا بالکل نامناسب ہے۔ پھر مجھے کہاں فرصت ہے کہ دوسروں کے بارے میں سوچوں؟ دراصل عدیم الفرصتی کے معنی یہ ہیں کہ دوسروں کے دکھ درد، موت وزندگی کے بارے میں سوچنے کے بجائے انسان صرف اپنے بارے میں سوچے...... یہ سوچنے کی مصیبت بھی ہم جیسوں کے سر لگی ہے ورنہ بڑا ہونے یا بڑا منصب ہونے میں ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ گھر سے ہاتھ میں بیگ لئے عین وقت پر نکلے......اگر دل چاہے تو جمع ہوئی بھیڑ ہونے کی وجہ دریافت کرلے......موت، چوری یا بیماری کا ذکر سنے......افسوس کرے......''اچھا'' کہے......کم وقت ہونے کا اظہار کرے......اس وقت جلدی میں ہوں، ڈپارٹمنٹ جا رہا ہوں پھر بات کریں گے......لو قصہ ختم......غم میں شرکت ہوئی......کارِ ثواب ملا...... ہینگ لگی نہ پھٹکری رنگ چوکھا نکل آیا۔

اس نے بغیر گنے چالیس قدم پورے کرلئے......چال سست کی، زندگی کی چال میں سستی آتی ہے تو اسپتال کی جانب رخ کرتی ہے۔ بلڈ بینک آفس کے سامنے، برآمدہ کی دیواروں سے پشت لگائے میلے کچیلے بدنما چہرے عجیب بے ڈھنگے پن سے بیٹھے بیڑیاں سوٗنت رہے ہیں، ہاتھوں میں چلم، چرس اور گانجہ کے دھوئیں سے ماحول کو چکرا دینے والی بُو، چاروں طرف پھیل کر زندگی کی بدزیب تصویریں بنا رہی ہے۔اندر جانے والی بے چین منتظر نگاہیں خون ٹپکا رہی ہیں۔ وہ سوچ رہے ہیں خون کی ایک ایک بوند گر بوتل میں ٹپک جائے تو قیمت وصول ہو جائے...... کب باری آئے اور چینا دور ہو جائے...... وہ بدحال لوگوں کے درمیان سے ہوتا ہوا سسٹ بٹ کمرے میں داخل ہو گیا۔تعلق ہونا اور ذرا کپڑے صاف ستھرے ہونے کا یہی فائدہ ہے......باقی لوگ منہہ پھاڑے اسے تکتے رہ گئے۔

''تم پھر آ گئے'' نرس نے چونک کر دیکھا

''جان! تم بن چین کہاں پاؤں''مسکراتے ہوئے آنکھ مچکائی

''سسٹر (sister) بولو''

''نرس کہنے میں کیا ہرج ہے؟''مسکراتے ہوئے

''میں تمہاری اماں نہیں ہوں'' خفگی کا اظہار

''تو پھر جان کہنے میں کیا ہرج ہے؟''

''جان کا اعتبار کیا؟ بڑی بے وفا چیز ہے'' رمزیہ انداز

''تب ہی تو مجھے پیار ہے''

''کیوں خودکشی کرتے ہو!''ایک صلاح

''خودکشی نہیں! خودکشیدگی''ایک جرأت مندانہ عمل

''تم سے تو میں ہار گئی''نرس نے سنجیدگی سے کہا اس کی آنکھیں بھیگ گئی ہیں

چند لمحے سکوت رہا۔سوچنے لگا''میں''اور''تم''کبھی نہیں ہارتے دراصل زندگی ہارتی ہے جیسے میں قطرہ قطرہ زندگی ہارنے میں جیت رہا ہوں ورنہ زندگی گزارنا مشکل ہو جائے گی۔سوچ سے ابھرنے کے بعد اس نے نرس کو دیکھا وہ ابھی تک بت بنی کھڑی تھی۔سنسار میں چاہے بھوُنچال آ جائے لیکن بت شانت رہتے ہیں۔کمرے میں مریضوں کے کراہنے کی آوازیں،فنائل اور اسپرٹ کی ملی جلی بو سے حلق میں کڑواہٹ گُھل رہی تھی

''کس سوچ میں ڈوبی ہو تم......(چند لمحے کا وقفہ)......چلوں بیڈ پر''اس نے آنکھ کا اشارہ کیا

''تم بے رحم انسان ہو''جیسے اسے رحم آ گیا ہو

''بے رحم......انسان ہو ہی نہیں سکتا''وہ مسکرایا

وہ بیڈ پر لیٹ گیا۔اس کا ذہن،چھت پر ٹنگے پرانے طرز کے پنکھے کی طرح دھیرے دھیرے ایک ہی سمت گھوم رہا ہے،خون بُوند بُوند بوتل میں ٹپک رہا ہے اور وہ قبر میں اترتا ہوا محسوس کر رہا ہے......آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہو رہی ہیں۔سارا جہاں جیسے سرخی میں ڈوب چکا ہے

بیڈ کے قریب آہٹ ہوئی اور ادھ کھلی آنکھیں پوری کھل گئیں،نرس کی آنکھیں آنسوؤں میں ڈوب رہی ہیں۔''ساری sorry انیمیا کی وجہ سے......پھر بھی یہ سو(۱۰۰)روپیہ......''الفاظ منہ میں پھنس گئے

اس کی نظر بوتل پر گئی بلڈ ہاف سے کم......حیرت سے اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا چہرے پر مایوسی کے ساتھ ساتھ بے چینی پھیل گئی۔آنکھوں کے نیچے اندھیرا اچھل گیا۔پیروں تلے زمین اپنی کیلی پر تیزی سے گھومنے لگی زندگی رات میں ڈوب گئی۔بوجھل قدموں کو برامدہ میں گھسٹنا شروع کر دیا اور دن کی تلاش میں قدموں کو تیز کر دیا۔اسپتال میں عجیب طرح کی خاموشی میں کبھی کبھی قدموں کی چاپ کانوں میں داخل ہو کر دماغ پر ضرب لگاتی......اچانک اس کی نگاہیں''پریکٹس فیملی پلاننگ''کے بورڈ پر رک گئیں اور جب سرخ رنگ کا لال تکون اس کے اندر داخل ہو گیا اس نے چونکتے ہوئے آنکھیں کھولیں اور چونکتے ہوئے ہکا بکا ادھر ادھر دیکھنے لگا......دن کی تلاش میں اندھیرے نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا اس کی نظریں ایک ساتھ شب و روز کا نظارہ کرنے لگیں......اس اثناء میں ڈاکٹر نے اس کی ہتھیلی پر کچھ رقم رکھ دی،رقم کو بغیر جمع و تفریق کئے وہ بڑی بے دلی سے اسپتال سے نکلا کیونکہ اس نے اپنے اندر پلنے والی نہ جانے کتنی زندگیوں کے قتل کا قصاص وصول کر لیا تھا......اچانک آنکھوں کے سامنے بیوی کا چہرہ آنے سے اس کا چہرہ اتر گیا۔شادی کے بعد بیوی سے عورت بننے کی کوشش نے اسے بے چین کر دیا خواہش تو میری بھی مکمل مرد بننے کی تھی......لے......کن اب تو میرا ادھورا پن،خالی پن کی طرف مقلب ہونے کے قوی امکانات پیدا ہو گئے۔اے مقلب القلوب یہ تو نے کیا کیا؟ مجھے تو میری مصروفیت نے اس موضوع پر سنجیدگی سے سوچنے کی فرصت ہی نہیں دی......بس پل بھر میں ایسا ہو گیا کہ میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔شاید سوچنے کا موقع اس لئے چھین لیا ہو کہ میری تقدیر میں یہی درج ہو......اے مسب الاسباب خود بخود اسباب ایسے بن گئے!......ایک لمحہ کے لئے خوف کی کپکپی اس کے اوپر طاری ہو گئی......رزق کے خوف سے روحوں کو قتل مت کرو......نطفہ داخل ہونے کے ساتھ ہم پستانوں میں دودھ بھی داخل کر دیتے ہیں......لیکن یہاں مسلۂ روٹی کا ہے؟

یہ من و سلوٰی نہیں جو آسمان سے اترے!......وہ اسپتال کے صدر دروازہ کو عبور کر چکا تھا۔اور سڑک پر آہستہ آہستہ،تھکا ماندہ چلنے لگا......اچانک ذہن میں کوندا لگا......جو بھی ہوا،اچھا ہوا۔آبادی کے طوفان کی زد سے دیش بچ گیا......اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آئی......رفتار میں تیزی پیدا ہو گئی......اس نے سڑک پر چاروں پر نظر دوڑائی انسانوں کی بھیڑ کے درمیان میں اپنے آپ کو تنہا پایا۔گھر کی جانب گلی کے موڑ پر اس کے قدم بھاری ہونے لگے......وہ مایوس ڈرا سہما اپنے بوجھل قدموں کو لئے گھر میں داخل ہوا۔چور نظروں کو چاروں طرف کبوتر کی طرح گھمایا......بیوی کو غیر حاضر

پا کر اسے قدرے سکون ہوا......لیکن وہ تو گھر ہی واپس آئے گی......گھڑی دو گھڑی کا انتظار کیا معنی رکھتا ہے؟ انتظار تو وہاں تکلیف دہ ہوتا ہے جب انتظار ہوتا ہے۔اور یہاں کس کو انتظار ہے؟ انتظار، اتصال اور وصل جیسے الفاظ نے اپنی معنی کھو دیئے ہیں......اسی کشمکش کو لئے اس نے اپنے بوجھل جسم کو آنگن میں پڑی ہوئی چارپائی پر ڈال دیا......خوف نہ انتظار بس ہلکی سی غنودگی سے آنکھیں ڈوبنے لگیں......اور قریب رکھے اسٹول پر اس رقم کو رکھ دیا۔

آفتاب اندھیرے میں ڈوب رہا تھا۔ ہلکی سیاہی پھیل چکی تھی......آہستہ آہستہ مفلس کے گھر کے اندھیرے کی طرح گہری ہونے لگی۔ وہ ضروریات زندگی کی اجناس لئے گھر کی طرف تیز قدموں سے آرہی تھی۔ پرچون کی دوکان سے مکان تک کا مختصر راستہ شیطان کی آنت ہو گیا تھا۔ زندگی ایک مختصر راستہ کا نام ہے یا زندگی اور راستہ کے بیچ گہری مماثلت ہے......زندگی دشوار تو راستہ بھی دشوار۔ زندگی خوشگوار تو راستہ بھی......زندگی ہی کیا...... کاروبارِ زندگی اور سنسار بھی خوشگوار ہو جاتا ہے......وہ سوچتی ہے یہ دنیا ہی مکافاتِ عمل نہیں بلکہ یہ سنسار ایک بازار ہے لین دین کا......

''آگے سودا لینے کے لئے پچھلا چکتا کر'' کرخت لہجہ جو اس کے ذہن پر ضرب لگا رہا تھا......وہ گھبراہٹ اور بے چینی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی......سڑک پر راہ گیروں کو راستہ چلنے کی دھن......شاید گھر پہنچنے کی جلدی......شام کا دھندلکا گہرا ہو رہا ہے......گھر پر کوئی انتظار کر رہا ہے......کاروبار زندگی سے فراغت ملنے پر گھر واپس ہونے کی دھن۔ معصوم بچوں کی مسکراہٹ میں ڈوبنے کی لگن......دھندے سے بھون تک بس جیون یاترا کا یہی سماپن ہے......اچانک راستہ میں کسی انجان راہ گیر سے وہ ٹکرائی اسے لگا ڈراکیولا جیسی خبیث صورت نے اسے جکڑ لیا ہو۔ اور جسم پر لمبے لمبے نکیلے دانت گڑا دیئے ہوں اور کتے کی طرح ہڈیاں چبا رہا ہو اور اپنے سیاہ موٹے موٹے ہونٹوں سے خون نچوڑ لیا ہو......وہ کسمسائی، ہاتھوں کی مضبوط گرفت سے نکلنے کی ناکام کوشش کی۔

''میری جان یہی دنیا کا کاروبار ہے کہ پچھلا چکتا کرنے پر اگلا کھاتہ کھلتا ہے'' اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے......اس نے نگاہ اوپر اٹھائی۔ دور آسمان کے اندھیرے میں ایک پرندے نے عقاب کی چونچ اور پنجوں کی پکڑ میں جبر و رضا یا شرمندگی و مجبوری میں اپنے آپ کو سونپ دیا اور بوند بوند خون زمین پر ٹپکنے لگا۔ اس منظر کو دیکھ کر وہ گھبرا گئی......اپنے حواس درست کئے......بدن کو سمیٹا......خوف کے احساس کے ساتھ ادھر ادھر دیکھنے لگی......بھری سبھا میں دروپدی کی طرح اس کا چیر ہرن ہو گیا ہو......اجناس کے تھیلے کو سختی سے پکڑا جیسے جسم و جان سے زیادہ قیمتی ہو راہ گیر آگے نکل چکا تھا......اس نے جلدی جلدی قدم آگے بڑھائے......گھر میں داخل ہوئی......اور اپنے بوجھل جسم کو آنگن میں پڑی چارپائی پر ڈال دیا......تھکن سے آنکھیں غنودگی میں ڈوبنے لگیں......اور قریب رکھے اسٹول پر اجناس کا تھیلا رکھ دیا......!

''بڑی دیر کر دی، اندھیرا گہرا ہو گیا ہے'' اُس کی آنکھیں بند ہیں

''آفتاب ڈوبنے کے بعد اندھیرا ہی ہوتا ہے'' اس نے غنودگی کے عالم میں جواب دیا اسے لگا جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو جبکہ آنکھیں بند ہیں جو کھلی کتاب کی طرح سچ بولتی ہیں......پھر اس نے یہ کیسے پڑھ لیا کہ آفتاب اندھیرے میں آ گیا؟ کچھ لمحہ خاموشی طاری رہی......

''دوکان دار کہہ رہا تھا۔ پچھلا چکتا کرو، اگلا کھاتہ تب کھلے گا'' اس نے کہا

''اب نیا کھاتہ کھولنے کی ضرورت نہیں ہے'' اس نے قدرے زور دے کر کہا آواز آنگن میں گونجی اور خاموشی ٹوٹ کر بکھر گئی۔

اس نے گھبراہٹ اور شرمندگی کے ملے جلے احساس کے ساتھ آنکھیں کھول دیں آنگن میں چاروں طرف نظریں دوڑائیں گھپ اندھیرا پھیلا ہے۔ ماحول میں سکوت طاری ہو گیا ہے۔ غنودگی کی وجہ سے آفتاب کی آنکھیں بند ہیں۔ اس نے قدرے اطمینان کی سانس لی۔ بڑی نقاہت اور تکان کے ساتھ وہ چارپائی سے اٹھی۔ روشنی کا بندوبست کیا۔ مسکراتے ہوئے ایک گہری نگاہ اس کے تھکے ہوئے چہرے پہ ڈالی اور رات کے معمولات میں مصروف ہو گئی یہ سوچ کر کہ صبح سے پہلے آفتاب نکلے گا، روشنی چاروں طرف پھیلے گی......اندھیرا کٹے گا!

☆☆☆

شیخ یٰسین جھونسوی حیات اور کارنامے

ارمان احمد، مدیر، سہ ماہی **عرفان**، عرفان ایجوکیشنل سوسائٹی، اولہن پور، چھپرا، بہار

شیخ یٰسین جھوسوی اپنے وقت کے جید عالم دین اور صوفی کامل تھے۔آپ کے حالات بہت کم تذکروں میں ملتے ہیں۔شیخ کے سلسلے میں جو بھی معلومات ہمیں مختلف ماخذوں میں ملتے ہیں ان کا سرچشمہ صرف دو ہی کتابیں ہیں۔ایک تو ''گنج ارشدی'' جو مخطوطہ کی شکل میں خانقاہ رشیدیہ جونپور کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ یہ شیخ محمد ارشد جونپوری کے ملفوظات کا مجموعہ ہے۔جس کو ان کے نبیرہ اور جانشین شیخ غلام رشید (متوفی ۱۱۶۷ھ) نے مرتب کیا ہے۔دوسرا ماخذ ''مناقب العارفین'' ہے۔جو خود شیخ یٰسین جھونسوی کی تصنیف ہے۔اس کتاب میں مصنف نے اپنے مرشد واستاذ مخدوم شاہ طیب بنارسی کے حالات کے ضمن میں جا بجا اپنا بھی ذکر کیا ہے۔''**گنج ارشدی**'' میں بھی بہت کچھ اسی کتاب سے استفادہ کیا گیا ہے۔باقی آپ کے حالات جہاں کہیں بھی ہیں انہی دو کتابوں سے ماخوذ ہیں۔صاحب ''بحر ذخار'' نے درج سطور پر ہی اکتفا کیا ہے۔

''آں حقائق آگاہ مشیخت آئیں حضرت شاہ یٰسین۔خلف وخلیفہ شاہ طیب بنارسی است، از حسن واخلاق وعبادت وریاضت، تواضع وتسلیم وارث والایت آباواجداد خود بود، ''مناقب العارفین'' نام کتاب در احوال اولیا جمع وآں نشر اصطلاح صوفیہ ومقامات ولایت کہ نوشتہ ایں کلمات صریح دلیل برصاحب باطنی اوست''۔

صاحب ''نذہۃ الخواطر'' علامہ عبدالحی الحسنی ''گنج ارشدی'' کے حوالے سے رقم طراز ہیں۔

''الشیخ العالم الفقیہ یاسین بن احمد بن محمد بن عبدالرحیم بن اوحد الصدیقی الجونپوری ثم البنارسی، احد المشائخ الچشتیہ۔۔۔''

آپ کی ولادت جونپور میں ۱۰۲۲ھ مطابق ۱۶۱۳ء میں ہوئی۔آپ نسلاً صدیقی تھے۔آپ کا نسب خلیفہ اول خضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ تک ان ناموں کے واسطے سے پہنچتا ہے۔حضرت شیخ یٰسین ابن شیخ احمد ابن شیخ محمد ابن شیخ عبدالرحیم ابن شیخ اوجھر صدیقی ابن لادلہ ابن شیخ نجم الدین ابن شیخ اسحٰق ابن شیخ صفی ثانی ابن شیخ عبداللہ ثانی ابن شیخ عبدالسمیع ابن شیخ عبدالشید ابن شیخ عبدالشہید ابن شیخ ابوسعید ابن شیخ ابوالمعالی ابن شیخ عبدالوالی ابن شیخ عبدالعزیز ابن شیخ اسمعیل ابن شیخ صفی الکبیر العربی ابن شیخ عبدالسلام ابن شیخ ابوالفضل ابن شیخ ابوعبداللہ ابن شیخ ابوخلیل ابن شیخ محمد ابن امیر المومنین ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ۔

آپ کی پرورش وپرداخت آپ کے مرشد حضرت شاہ طیب بناری کے زیر سایہ عاطفت منڈواڈیہ، بنارس میں ہوئی۔شاہ طیب بنارسی نے اپنے فرزند صلبی کی طرح آپ کی کفالت وتربیت کی ذمیداری انجام دی۔حضرت طیب بنارسی آپ کو بہت محبوب رکھتے تھے۔ساتھ کھانا کھلاتے اور گھی ڈال کر کھلاتے تاکہ آپ کا دماغ مضبوط ہو۔آپ کے ہر کام پر حضرت کی نظر ہوتی۔فرماتے نفل روزے مت رکھو ابھی تمہارے لئے مناسب نہیں۔تہجد کی نماز ضرور پڑھو اور اسکے بعد پڑھنے بیٹھ جاؤ۔آپ نے علوم دینیہ کی تحصیل اپنے مرشد برحق شاہ طیب بنارسی کے علاوہ شیخ جمال الاولیا کوڑوی، شیخ محمد رشید مصطفیٰ عثمانی، شیخ شہاب الدین ترکمانی، شیخ ملا افضل جونپوری سے فرمائی۔علاوہ ازیں شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے فرزند کبیر شیخ نور الحق دہلوی سے بھی حدیث کی سند لی۔

علوم ظاہری کی تکمیل کے بعد علوم باطنی کی تکمیل کی طرف مائل ہوئے، چنانچہ انیس سال کی عمر میں حضرت مخدوم شاہ طیب بنارسی سے بیعت ہوئے اور بیس سال کی عمر میں جمیع سلاسل کے خلافت واجازت سے مرشد نے سرفراز فرمایا۔استاذ گرامی شیخ محمد رشید مصطفیٰ عثمانی سے بھی خلافت واجازت حاصل کی۔شیخ محمد رشید آپ کو بہت دوست رکھتے تھے۔اپنے مملوکات اور آپ کے مملوکات میں کوئی فرق نہیں رکھتے تھے۔بے مانگے اپنی چیزیں آپ کے حوالہ کر دیتے۔آپ کو بھی شیخ کی خدمت میں بہت اعتقاد تھا۔شیخ محمد رشید بھی اپنے مرشد کے جانشین ہونے کی حیثیت سے آپ کا کما حقہ ادب کرتے

تھے۔آپ دونوں کے تعلقات مختلف نوعیت کے تھے۔ دونوں ہی بزرگ ایک ہی شیخ کے مجاز وخلیفہ تھے۔آپ دونو ہم درس تو نہ تھے عمر میں بھی بیس سال کا فاصلہ تھا لیکن استاذ العلما ملا افضل جونپوری کے دونوں شاگرد تھے۔شیخ محمد رشید، شیخ یٰسین کے استاذ بھی تھے اور مرشد بھی۔شیخ یٰسین نے آپ سے روحانی نعمتیں بھی حاصل کی تھیں۔ دونوں حضرات کے درمیان تعلقات بہت صمیمانہ، مخلصانہ اور عقید تمندانہ تھے۔ جب بھی شیخ یٰسین کسی عقد سے دوچار ہوتے شیخ محمد رشید سے رجوع فرماتے اور آپ انکی تشفی کرتے اور انکے مسائل کو حل کر دیتے۔آپ دونو کے درمیان بہت خط و کتابت ہوتی۔شیخ یٰسین جھونسوی کے لکھے خط تو دستیاب نہیں پر شیخ محمد رشید کے تحریر کردہ بہت سے جوابات ''**مکاتبات عارفین مع ضمیمہ مکتوبات جمالی**'' میں موجود ہیں۔اس میں شیخ محمد رشید کے سوخطوط بزبان فارسی شامل ہیں جو آپ نے اپنے معاصرین کو تحریر فرمائے ہیں۔ یہ مجموعہ مکاتب شایع ہو چکا ہے۔ان جوابی خطوط کا مطالعہ عام قاری کے لیے اور بالخصوص ارباب تصوف کے لیے بہت مفید ہے۔ یہ خطوط مختصر اور جامع ہیں، اور انکی زبان میں سلاست وروانی ہے۔چھوٹے چھوٹے جملوں میں بڑی بڑی باتیں کہی گئیں ہیں۔موضوعات مختلف اور متنوع ہیں۔

شیخ یٰسین جھونسوی کو تصنیف وتالیف کا بھی شوق تھا۔فارسی زبان میں ''**مناقب العارفین**'' آپ کی مایہ ناز تصنیف ہے۔اس کتاب میں ۴۲۱ھ سے لیکر ۱۰۴۲ھ تک کے اکابر علما و مشائخ کے حالات وکوائف جمع کیے گئیں ہیں۔شیخ یٰسین جھونسوی نے ''مناقب العافین'' کے مقدمہ میں اس امر کی وضاحت کی ہی کہ انہوں نے یہ کتاب کیوں لکھی، اور اس کی تحریک کیسے ہوئی۔انکی تحریر کے مطابق وہ مدتوں کسی ایسی کتاب کی جستجو میں تھے جس میں مشائخ چشت سلف کے احوال ہوں۔ جہاں کہیں بھی معلوم ہوتا کہ کوئی کتاب اس موضوع پر دستیاب ہے اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔آپ کو حضرت عبدالحق محدث دہلوی کی کتاب ''**اخبارالاخیار**'' مل گئی۔آپ نے اس کا مطالعہ کیا، اس کتاب میں اپنے مرشد کے سلسلے کے بزرگوں کے حالات کو دیکھ کر بہت مسرور ہوے۔ کچھ دنون بعد آپ کے دل میں یہ بات آئی کے کیوں نہ حضرت مخدوم شاہ طیب بنارسی، ان کے مرشد حضرت شیخ تاج الدین اور دیگر مشائخ طریقت کے حالات کو معرض تحریر میں لایا جائے۔اسی خیال نے انکی توجہ ''**مباقب العارفین**'' کی ترتیب وتالیف کے طرف مبذول کرائی۔ چنانچہ شیخ یٰسین جھونسوی اپنے مرشد حضرت شاہ طیب بنارسی سے لیکر حضرت خواجہ مبارک سوندھو، ان بزرگوں کے مخصوص مریدین، اجلّ خلفا، طالبین، مسترشدین، برادران وفرزند کے حالات خود جمع کیے اور انہیں ضبط تحریر میں لائے۔حضرت شیخ محمد عیسیٰ تاج سے لیکر حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے حالات ''**اخبارالاخیار**'' اور دیگر کتب سے حاصل کر کے اسمیں شامل کیا۔جن کتابوں سے انھوں نے استفادہ کیا ہے جا بجا ان کا ذکر بھی کیا ہے۔

جامع ملفوظ نے شاہ طیب بنارسی سے لیکر حضرت خواجہ مبارک سوندھو تک جو حالات تحریر کیے ہیں۔ان کا ماخذ انکی ذاتی معلومات، ثقات اور معتبر افراد کی فراہم کردہ اطلاعات ہیں۔ان بزرگوں کے سلسلے میں انھوں نے صرف دو مقامات پر ایک رسالہ کا حوالہ دیا ہے پر اس کا نام نہیں لکھا ہے۔اسکے مولف شیخ مصطفیٰ جونپوری ہیں۔شیخ یٰسین نے اپنے مرشد شاہ طیب سے لیکر حضرت خواجہ سوندھو تک جن بزرگوں کے احوال وکوائف بیان کیے ہیں وہ بزرگان دین اور اولیا کاملین کے تذکروں میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ان بذرگوں کے حالات کسی دوسرے تذکروں میں تفصیلاً نہیں گزرے۔آپ نے یہ ایک گراں قدر علمی خدمات انجام دی ہے۔''**مناقب العارفین**'' کے متعلق ''علما بنارس کا شاندار ماضی'' کے پیش لفظ میں سلام اللہ صدیقی لکھتے ہیں۔

''مولانا عزیز اللہ یمنی یمن سے ہندوستان آئے اور آپ نے ایک کتاب ''گوہرستان المعروف بہ مناقب الاصفیا'' ۶۴۷ھ میں اور شیخ یٰسین صدیقی جونپوری (شیخ یٰسین جھونسوی) نے ۱۰۵۴ھ میں ''**مناقب العارفین**'' لکھی۔ یہی دونوں کتابیں بعد کے تذکروں سے متعلق کتابوں کا اصل ماخذ قرار پائیں۔ان کے علاوہ جو کتب لکھی گئیں وہ ناپید ہیں۔

''**مناقب العارفین**'' کا ایک نسخہ مخطوطہ کی شکل میں خانقاہ رشیدیہ جونپور کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ یہ کتاب سوانح اور ملفوظات کا مرکب ہے۔ یہ کتاب ''بحر ذخار'' کی طرح ضخیم تو نہیں اور نہ اس میں سیکڑوں علما و مشائخ کے حالات درج ہیں۔ پھر بھی اس کی حیثیت ایک اچھی خاصی کتاب کی ہے۔ یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔کتاب کا اصل متن کاتب حروف کے دیے ہوئے نشانات کے مطابق ۲۴۰ صفحات پر مشتمل ہے۔اس میں خانقاہ

رشیدیہ جونپور کے پیران سلاسل کا ذکر قدرے تفصیل کے ساتھ ہے۔ جونپور میں جونسخہ موجود ہے وہ اصل کی نقل ہے۔اس کتاب کے اصل نسخہ کا پتہ نہیں ہے۔ پروفیسر غلام سمنانی نے اس کے ایک حصہ کا ترجمہ کیا تھا جسے خانقاہ رشیدیہ نے ۲۰۰۰ء میں شایع کیا تھا۔ موصوف لکھتے ہیں۔

''یہ مفید، فیض بخش، فیض رساں اور معلومات افزا کتاب اپنے زمانہ تالیف سے لیکر اب تک پردۂ خفا میں رہی۔ اس کتاب کا اصل نسخہ نظروں سے نہیں گزرا لیکن اس کے اصل کی تصویر ضرور پیش نظر ہے، یہ تصویر زیب سجادہ خانقاہ رشیدیہ جونپور مجمع الفضائل والمکارم حضرت مولانا الحاج مفتی محمد عبیدالرحمٰن صاحب زیدمجدہ کے واسطے سے حاصل ہوئی۔ اس کتاب کی تصویر کے سرورق کی عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا اصل نسخہ ''**کتب خانہ قدیم مظہرالعلوم بنارس**'' کی ملکیت ہے۔ اسکی سن تالیف کے متعلق یہ جملہ سرورق پر لکھا ہوا ہے۔ 'این تالیف در سنہ یکہزار و پنجاہ و چہار بسلک تحریر آمد''۔

''**مناقب العارفین**'' مطالعہ سے اس امر کی نشاندہی بالکل نہیں ہوتی کے جامعہ ملفوظ نے اس کی تحریر وترتیب کا آغاز کب کیا۔ لیکن یہ بات بالکل واضح ہے کہ اس ملفوظ کی تکمیل ۱۰۵۴ھ میں ہوئی۔ جامع ملفوظ نے جب بھی کسی شیخ طریقت کے حالات شروع کئے ہیں تو بطور القاب چند تعارفی کلمات کا استعمال کیا ہے۔ جو شیخ کے جملہ روحانی کمالات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ان تعارفی کلمات سے خود جامع ملفوظ کے مبلغ علم اور عبارت آرائی کی صلاحیت کا پتہ چلتا ہے۔

'' آں فرد یگانہ۔ آں غوث زمانہ، آں جامع معانی و دقائق، آں منبع اسرار حقائق، آں نہنگ دریائے شریعت، آں شیر بیشۂ طریقت، آں شہباز عالم ملکوت، آں بلند پرواز فضائیلا ہوتی، آں متمکن در مقام تمکین حضرت بندگی شیخ طیب بن معین الدین از مقتدائے مشائخ زماں و پیشوائے اولیا جہاں بود۔۔۔۔۔

ان کلمات سے واضح ہوتا ہے کہ جامع ملفوظ کو مقفٰی و مسجع عبارت کی تحریر پر قدرت کاملہ حاصل تھی۔ لیکن یہ روش مصنف نے کتاب کے اصل متن میں اختیار نہیں کی ہے۔ اپنے مطالب کو سادہ، آسان اور رواں زبان میں بیان کرنا پسند کیا ہے۔ عبارت اضطراب اور ژولیدگی سے پاک ہے۔ کہیں کہیں پر جامع ملفوظ نے کسی شیخ کے قول و فعل کی اپنی فہم کے مطابق وضاحت یا تاویل کی ہے۔ کہیں کہیں پر تصوف کے کسی مسئلہ اپنی جامع رائے کا بھی اظہار کیا ہے۔ جابجا قرآنی آیات، احادیث نبوی اور صوفیا کرام کے اقوال کے حوالے بھی ملتے ہیں۔ جو جامع ملفوظ کے تجر علمی، طریقت و شریعت کے مسائل پر انکی دقت نظری کی دلالت کرتے ہیں۔

آپ کا انتقال ۵۴ سال کی عمر میں ۲۴ رجب ۱۰۷۴ھ کو جھونسی الہ آباد میں ہوا۔ مخدوم تاج الدین جھونسوی کے مزار سے متصل جھونسی، الہ آباد میں دفن کئے گئے۔

مراجع ومصادر۔

الحسنی، عبدالحئی۔ **نذہۃ الخواطر**۔ بیروت: دارابن حزم، ۱۹۹۹ء۔ پرنٹ
بنارسی، مخدوم شاہ طیب۔ **صلوۃ طیبی** موسوم بہ دینی احکام۔ نئی دہلی: شاہ عبدالعلیم آسی فاؤنڈیشن۔ ۲۰۱۴ء۔ پرنٹ
جھونسوی، شیخ یٰسین۔ (ترجمہ سمنانی پروفیسر سید غلام)۔ (ترجمہ) **مناقب العارفین**۔ جونپور: خانواہ رشیدیہ۔ ۲۰۰۰۔ پرنٹ
صدیقی، سلام اللہ۔ علماے بنارس کا شاندار ماضی۔ وارانسی: تنویر بک ڈپو، ۱۹۹۴۔ پرنٹ
کاتب، عبدالحمید۔ **سمات الاخیار**۔ بہرائچ: کلیل المطابع۔ ۱۳۴۴ھ۔ پرنٹ
نعمانی، عبدالسلام۔ تذکرہ مشائخ بنارس۔ وارانسی: پرنٹیا پبلی کیشن۔ ۲۰۱۳ء۔ پرنٹ

☆☆☆

حالی کی نظم نگاری انجمن پنجاب کے حوالے سے

سید محمد ظفر اقبال، شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

اردو زبان وادب کی دنیا میں انسانیت کے وصف خاص کی مخصوص قبائے زیبا حالی کے بدن پر ہی سجتی تھی، اس لئے کہ وہ ادب کے تخلیق کار ہونے کے علاوہ انسانیت اور شرافت، عاجزی وانکساری، ایثار و جان نثاری، خلوص ومحبت، حیا ومروت اور صبر وضبط کی طاقت پر اپنی بھر پور قدرت رکھتے تھے۔

مولانا الطاف حسین حالی خداداد صلاحیت کے مالک تھے۔ ان کی شاعری ابتدا سے ہی روش عام سے ہٹ کر شروع ہوئی تھی۔ ان کے سینے میں اس وقت کی روایت کے مطابق عشق کا روگ نہیں، بلکہ ملک وقوم کی زبوں حالی کا سوگ تھا۔ حالی کا آبائی تعلق پنجاب سے تھا، اور پنجاب ہر عہد میں نشاط وامید کا صوبہ رہا ہے اور حالی کے اندر نشاط وامید کی یہ کیفیت ان کی اسی سرزمین کی دین ہے، جس نے مزید جلا سرسید احمد خان کی صحبت میں پائی۔ حالی کے اندر عام زندگی اور ادب میں بیداری لانے کا ایک جنون تھا جو انہیں سرسید تحریک کے بھی قریب لے گئی اور انجمن پنجاب سے بھی جوڑا۔

انجمن پنجاب جس کا پورا نام "انجمن اشاعت مطالب مفیدہ پنجاب" تھا، کا قیام تعلیمی اور معاشرتی اصلاح کے لئے حکومت کے ذریعہ ۲۱ / جنوری ۱۸۶۵ء کو ڈاکٹر لائز کی نگرانی میں عمل میں آیا۔ اس انجمن کے اغراض ومقاصد میں مشرقی علوم کا تحفظ، صنعت وتجارت کا فروغ، ہندوستانیوں میں اپنی مقامی زبان کے ذریعے مفید علوم کی اشاعت، علمی، سماجی، سیاسی اور ادبی مسائل پر مذاکروں کا اہتمام، عوام اور حکومت کے مابین تعلق استوار کرنا، دوسرے خطوں اور صوبوں کے ساتھ روابط پیدا کرنا وغیرہ تھا۔

انجمن کے قیام کے دو برس بعد یعنی ۱۸۶۷ء میں اس کے سکریٹری مولانا محمد حسین آزاد مقرر ہوئے تو انہوں نے انجمن کے پلیٹ فارم سے ادب برائے زندگی کے تحت اردو میں نئے ادب کو تخلیق کرنے کی ترغیب وتحریک شروع کی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انجمن کے نظامی منظر سے ڈاکٹر لائز اوجھل ہو گئے اور مولانا محمد حسین آزاد بتدریج نمایاں ہوتے چلے گئے۔ آزاد نے اردو کے ہم مزاجوں کا ایک حلقہ بنا کر ۱۸۷۴ء میں موضوعاتی شاعری کرنے کا بیڑہ اٹھایا، اور اس طرح طرحی مشاعرے کی طرز پر موضوعاتی مشاعرے کی بنیاد ڈالی۔

۱۸۷۲ء میں مولانا حالی لاہور آ کر سررشتۂ تعلیم پنجاب سے وابستہ ہو گئے تھے، چنانچہ جب مولانا محمد حسین آزاد نے انجمن پنجاب کا پہلا موضوعاتی مشاعرہ ۱۹/اپریل ۱۸۷۴ء کو لاہور میں منعقد کیا تو اس میں انہوں نے مولانا حالی کو بھی مدعو کیا۔ حالی نے اپنی کتاب "مجموعۂ نظم حالی" کے دیباچے میں اس مشاعرے کے متعلق لکھا ہے کہ؛

> "سررشتۂ تعلیم پنجاب کی تائید سے انجمن پنجاب نے ایک مشاعرہ قائم کیا تھا، جو ہر مہینے میں ایک بار انجمن کے مکان میں منعقد ہوتا تھا، اس مشاعرے کا مقصد یہ تھا کہ مشرقی شاعری جو کہ عشق وعاشقی اور مبالغے کی جاگیر ہوگئی ہے۔ اس کو جہاں تک ہو وسعت دی جائے"

صحیح معنوں میں یہی وہ مشاعرہ تھا جس سے اردو شاعری کا آغاز ہوا۔ اس پہلے مشاعرے کا موضوع "برسات" طے پایا تھا۔ مولانا حالی نے موضوع کے تحت مثنوی کی ہیئت میں جب اپنی نظم "برکھارت" پیش کی تو عوام کو زبان کے جدید رنگ وآہنگ اور استعمال سے لطف اندوز ہونے کی نئی تحریک ملی۔ بارش سے پہلے کی گرمی کو ہندوستانی احساسات کے ساتھ حالی نے یوں بیان کیا ہے؛

گرمی سے تڑپ رہے تھے جاندار　　اور دھوپ میں تپ رہے تھے کہسار
تھی لوٹ سی پڑ رہی چمن میں　　اور آگ سی لگ رہی تھی بن میں

سانڈے تھے بلوں میں منہ چھپائے　　اور ہانپ رہے تھے چار پائے
تھی لومڑیاں زبان نکالے　　اور لو سے ہرن ہوگئے تھے کالے

لاہور میں انجمن پنجاب کے ذریعہ ۱۸۷۴ء سے ۱۸۷۵ء تک یعنی ایک برس میں برسات، حب الوطن، مروت، زمستان، امن، اور قناعت جیسے موضوعات پر دس مشاعرے منعقد ہوئے جن میں سے چار مشاعروں میں مولانا حالی نے اپنی نظمیں برکھارت، نشاط امید، حب الوطن اور مناظرۂ رحم وانصاف پیش کیں۔ نظم "حب الوطن" میں حالی نے خصوصیت کے ساتھ یہ التزام رکھا کہ ہندوستان کے غیر مسلم باشندوں کی قومی خدمات کو بھی عیاں کیا جائے چنانچہ آریوں کی فتوحات کا ذکر کرتے ہوئے اس نظم میں حالی نے ہندی الفاظ کو بھی بخوبی استعمال کیا ہے۔

حملہ جب قوم آریا نے کیا　　اور بجا ان کا ہند میں ڈنکا
شرر کہلائے ، راکشش کہلائے　　مگر پردیس کے مگر نہ اٹھائے
گو غلامی کا لگ گیا دھبا　　نہ چھٹا ان سے دیس پر نہ چھٹا

اس نظم میں حالی نے وطن دوستی کے حوالے سے رامائن کی بھی خوبصورت جھلکیاں پیش کی ہیں؛

جب ملا رام چند کو بنباس　　اور نکلا وطن سے بن کر اداس
باپ کا حکم رکھ لیا سر پر　　پر چلا ساتھ لے کے جگر
پاؤں اٹھتا تھا اس کا بن کی طرف　　اور کھنچتا تھا دل وطن کی طرف

نظم "حب وطن" کی طرح حالی کی مثنوی" نشاط امید "ان کی شعری اصلاحی تحریک کا ایک بہت اہم اور بڑا پیش خیمہ کہا جا سکتا ہے۔ حالی نے اسے جدید نظم نگاری کے وسیع امکانات کے احساس کے ساتھ نظم ہی نہیں کیا بلکہ اس سے ترقی نظم کی جو امیدیں وابستہ تھیں وہ اس کی مقبولیت سے پوری بھی ہوئیں۔ اس نظم کو حالی نے انجمن پنجاب کے چوتھے مشاعرے منعقدہ ۳۰/اگست ۱۸۷۴ء کو پیش کیا تھا، چند اشعار ملاحظہ ہوں؛

اے مری امید ، میری جاں نواز　　اے مری دلسوز ، میری کارساز
ہوتی ہے تو پست پر ہمت کی جب　　شکلیں آسان نظر آتی ہیں سب
جاتا ہے قابو سے دل آخر نکل　　کرتی ہے ان مشکلوں کو تو ہی حل

انجمن پنجاب کی تحریک نے حالی کے اصلاحی مزاج کی اور بھی آبیاری کی۔ ۱۸۷۲ء تک حالی نے پنجاب میں رہ کر فطری شاعری سے اپنا مضبوط رشتہ قائم کر لیا۔ حالی قوم کی زبوں حالی سے افسردہ و آزردہ رہتے تھے، وہ قوم کی خستہ حالی کو سدھارنے کے لئے کمر بستہ ہوگئے، اس کے لئے انہوں نے اپنے اظہار کا مؤثر ذریعہ نظم کو قرار دیا، جس کے لئے آسان، عام فہم اور سیدھی سادھی زبان استعمال کرنے کی طرح ڈالی، چنانچہ وہ مقدمہ شعروشاعری میں اپنے ان خیالات کا اظہار بڑی تفصیل سے کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ؛

"... اردو پر قدرت حاصل کرنے کے لئے صرف دلی اور لکھنؤ کی زبان کا تتبع ہی کافی نہیں بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ عربی وفارسی میں کم سے کم متوسط درجے کی لیاقت نیز ہندی بھاشا میں فی الجملہ دستگاہ بہم پہونچائی جائے..."

(مقدمہ شعروشاعری؛ص:۴۸)

حالی نے اپنی نظموں کا موضوع بطور خاص عورت کی پسماندگی اور ناخواندگی کو بنایا۔ حالی سے پہلے کی شاعری میں عورت عام طور پر صرف ایک محبوب کی حیثیت سے رہی ہے، اس کے مراحل ومسائل کو بھی کسی شاعر نے قابل توجہ نہ جانا تھا۔ حالی پہلے شاعر ہیں جنہوں نے اس طرف ہمدردانہ اور مخلصانہ پہل کرتے ہوئے عورت کے ایثار اور جذبۂ خدمت ومحبت کو اجاگر کیا۔ حقوق نسواں کے لحاظ سے حالی کی مثنوی" مناجات بیوہ" اور نظم "چپ کی

داد" ایسی شاہکار تخلیقات ہیں کہ ان کی تاثیر ہر حساس انسان کے رونگٹے کھڑے کر دیتی ہے۔ "مناجات بیوہ" عورت کے ساتھ سماج کی بدسلوکی کے جاں گداز واقعات پر مبنی عبرت ناک داستان ہے جسے حالی نے عورتوں ہی کی زبانی بیان کیا ہے۔

اے مرے زور اور قدرت والے　　　حکمت اور حکومت والے
میں لونڈی تیری دکھیاری　　　دروازے کی تیری بھکاری
موت کی خواہاں جان کی دشمن　　　جاں پہ آپ اجیرن
سہہ کے بہت آزار چلی ہوں　　　دنیا سے بیزار چلی ہوں
کوئی نہیں دل کا بہلاوا　　　کاٹوں گی کس طرح رنڈاپا

انجمن پنجاب کی اصلاحی، تعلیمی اور تعمیری تحریک کے زیر اثر حالی نے "مناجات بیوہ" کی طرح جو ۲۷ اشعار پر مشتمل دوسری نظم "چپ کی داد" تخلیق کی اس پر انہیں خود بھی ناز تھا۔

"چپ کی داد" کا موضوع عورتوں میں تعلیمی بیداری پیدا کرنا تھا۔ حالی نے اس نظم کے ذریعے مردوں کی بالا دستی والے سماج میں عورتوں کی عزت کو تسلیم کرایا اور عورتوں کو خود شناسی کی یہ کہہ کر تحریک دی کہ؛

اے ماؤ! بہنو! بیٹیو! دنیا کی زینت تم سے ہے　　　ملک کی بستی ہو تم ہی، قوموں کی عزت تم سے ہے
تم گھر کی ہو شہزادیاں، شہروں کی ہو آبادیاں　　　غمگیں دلوں کی شادیاں، دکھ سکھ میں راحت تم سے ہے

انجمن پنجاب کی تحریک سے مولانا حالی کی سوچ میں جو تبدیلی پیدا ہوئی اس کی مثال ان کی روزمرہ کی عام فہم زبان ہے، حالی نے اپنے پیش روؤں کے حسن بیان و کمال اور رعنائی خیال کو ثانوی حیثیت دی اور بنیادی حیثیت عوام تک پیغام رسانی کو حاصل رہی ہے۔

اردو نظم کا فروغ اور موضوعاتی نظم کی تحریک، انجمن پنجاب کا بنیادی مشن تھا۔ جسے آزاد کے ساتھ ساتھ حالی نے انسانی فطرت کے اصل رنگوں سے سجایا، انسانی فطرت کے خارجی زاویے کم ہوئے اور داخلی ردعمل زیادہ ابھر کر سامنے آیا۔ حالی نے اپنی موضوعاتی نظموں کے علاوہ "مسدس حالی" پیش کر کے مذہبی حوالے سے قوم کو ایک نیا شعور بھی عطا کیا ہے۔

☆☆☆

حالی بحیثیت سوانح نگار

ناظرہ الحق، شعبہ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

خواجہ الطاف حسین حالیؔ ۱۹ویں صدی کے عبوری اور انتشار کے دور کی پیداوار تھے۔ حالیؔ نے نواب عمادالملک سید حسین بلگرامی کی فرمائش پر ۱۹۰۱ء میں اپنی زندگی کے مختصر حالات درج کئے تھے جس میں وہ خود تحریر کرتے ہیں کہ میری ولادت تقریباً ۱۲۵۳ھ بہ مطابق ۱۸۳۷ء میں بمقام قصبہ پانی پت جو شاہجہاں آباد سے جانب شمال ۵۲ میل کے فاصلے پر ایک قدیم بستی ہے، میں واقع ہوئی۔ ان کا خطاب ''شمس العلما'' اور ''حالیؔ'' تخلص تھا۔ دہلی میں ذوقؔ، شیفتہؔ، اور غالبؔ کی صحبت میں رہے۔ ان کی وفات کے بعد وہ لاہور چلے گئے جہاں انہوں نے کرنل ہالرائڈ اور محمد حسین آزاد سے فیض اٹھایا۔ ۱۸۷۵ء میں دہلی کے اینگلو عربک کالج میں عربی کے مدرس کی حیثیت سے تقرری ہوئی۔ تو سرسید کے قریب آئے جن کے کارناموں سے وہ غائبانہ طور پر واقف تھے ذہنی ہم آہنگی اور بے لوث خدمت کے جذبے نے ان کو سرسید کے قریب کیا۔

حالیؔ تعلیم وتربیت کے زبردست حامی تھے اور سرسید پر فدا ہونے کا سبب بھی یہی تھا کہ سید والا نے حصول علم کے لئے تن، من، دھن کی بازی لگا دی تھی۔ ''حیاتِ جاوید'' میں حالیؔ نے اس کا بار بار اعتراف کیا ہے کہ سرسید نے تمام خرابیوں کی اصلاح اور مشکلات کا حل اس بات میں دیکھا کہ قوم میں تعلیم کی اشاعت کی جائے۔ حالیؔ کی سرسید احمد خان سے بے پناہ عقیدت کا اظہار حیات جاوید کے اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے۔

''کسی بزرگ کا قول ہے کہ ''اچھے دوست کی مثال ایسی ہے جیسے ایک گنجان میوہ دار درخت کہ جب تک سرسبز ہے، اس کے سایہ میں راحت ملتی ہے اور اس کے پھل سے لذت حاصل ہوتی ہے اور جب خشک ہوگیا تو اپنی لکڑی سے طرح طرح کے فائدے پہنچاتا ہے''۔ یہی مثال ہمارے ہیرو سرسید کی تھی، وہ بھی مسلمانوں کا ایک ہی دوست تھا، جب تک زندہ رہا، اپنے ہاتھ، پاؤں، زبان، قلم، جان اور مال سے ان کی مدد کرتا رہا اور جب مرگیا تو اپنی محبت اور اپنے کام کی عظمت کا نقش لوگوں کے دلوں میں یادگار چھوڑ گیا تاکہ ان کی بھلائی کا کام، جو اس نے ادھورا چھوڑا ہے اس کو سب مل کر پورا کریں''۔

حالیؔ جدید اُردو ادب کے معمار ہیں انہوں نے نظم ونثر دونوں پر غیر معمولی اثرات ڈالے ہیں۔ تحریک علی گڑھ کے خیالات ورجحانات کو پھیلانے اور استحکام بخشنے میں بہت کام کیا ہے۔ زندگی اور ادب کے رشتہ کو سب سے پہلے شعوری طور پر تلاش کیا ہے۔

ادب ادیب کے شعور کا تخلیقی اظہار ہے اس لئے اسے سمجھنے کے لئے شعور تک رسائی ضروری ہے اور شعور کا احاطہ کرنا بہت مشکل ہے کیونکہ وہ کسی جامد وساکن کیفیت دماغ کا نام نہیں ہے۔ ادیب کے شعور میں سماج کی بدلتی ہوئی نفسیات اور ماحول کے جلوہ صد رنگ کے اثرات ہوتے ہیں جو کبھی واضح رنگ اختیار کرتے ہیں اور کبھی چھپ چھپ کر نمایاں ہوتے ہیں۔ معاشرتی اور ماحولی تبدیلیاں ادیب کے ظرف کے مطابق ہی اثر انداز ہوتی ہیں۔ اکثر وہ غیر محسوس طور پر رونما ہو کر اس کا زاویہ نظر متعین کرتی ہیں لیکن عظیم فنکار اور ادیب معاشرے کی بدلتی ہوئی نفسیات اور ضروریات کا ادراک کرتے ہیں اور اپنے نظریہ کو انہیں کے مطابق ڈھالتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کا زمانہ وہ زمانہ تھا جس نے حالیؔ کو غور وفکر کرنے کا موقع دیا اور اسی زمانہ میں ان کے تعلیمی رجحان کو فروغ حاصل ہوا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد صورت حال نے انہیں عشق وعاشقی کی واردات سے الگ ہٹ کر سوچنے پر مجبور کیا۔ قوم کی بدحالی کا نقشہ ان کے سامنے تو تھا ہی نواب شیفتہ سے سادگی اور اصلیت کا سبق لے چکے تھے اور انگریزی تعلیم کی طرف ان کو رغبت حاصل ہوئی۔ انہیں جس طرح زندگی کے ہر شعبے میں اصلاح کی ضرورت ہوئی ویسے ہی ادب میں بھی انہیں بے شمار خامیاں نظر آئیں جن کی نشان دہی ان کو ضروری معلوم ہوئی، یہ ان کا ذاتی اور انفرادی رویہ تھا جسے انہوں نے پروان چڑھایا۔ انگریزی خیالات نے ان کے بند دریچوں کو کھول دیا۔ سرسید سے ملاقات کے بعد ان کے خیال اور تصورات کو تقویت ملی۔ مگر ایسا بالکل نہیں ہے کہ سرسید ایک لیڈر تھے اور حالیؔ ان کے مقلد۔ بلکہ یہ کہا جائے تو بہتر ہوگا کہ ایک نظریہ کے حامل دو افراد جو قوم

کی فلاح و بہبود چاہتے تھے یکجا ہوگئے۔حاؔلی نے اپنے خیالات اور تصورات کی ایک نئی راہ قائم کی اورسرسید سے جہاں بھی اختلاف کی گنجائش ہوئی اختلاف کیا۔حاؔلی نے ۱۸۵۷ء کے بعد کی صورت حال میں معاشرتی اور اجتماعی مسائل پر نئے انداز میں غور وفکر کرنا شروع کیا۔اس سے قبل انگریزوں کے ذریعے ناقص ہی سہی مگر ایک نظام تو تھا لیکن اس کے بعد انگریزوں کے انتقام اور ملک کی سیاسی ابتری کے سبب وہ اخلاقی قدریں،تہذیبی ورثے، معاشی بدحالی،تعلیمی اورادبی پستی جو اٹھارویں صدی سے انیسویں صدی کے نصف اوّل تک گراوٹ کا شکار تھیں مزید ٹوٹنے اور بکھرنے لگیں۔ پھر یہ کہ ہندوستانی عوام تشکیک اور ابہام کی صورت حال سے دوچار تھی۔حاؔلی دراصل اسی دور کی پیداوار تھے۔مابعد غدر کے نثر نگاروں میں حاؔلی کا شعور سب سے متحرک اور جاندار تھا انہوں نے اپنے پورے تصورحیات کو نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا اوراس کی اشاعت وترویج کے لئے ادراک کو آلۂ کار بنایا۔حاؔلی نے جس فراخ دلی کے ساتھ سرسید کو **"فادر آف اُردو لٹریچر"** قرار دیا اور جس فطری خاکساری کے ماتحت اپنی کوششوں کو چھپائے رکھا اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ غلط فہمی پیدا ہو جائے لیکن حقیقت بالآخر آشکار ہو کر رہتی ہے۔

حاؔلی ادب اور معاشرے کے تعلقات سے بخوبی واقف تھے''حیات سعدی''میں انہوں نے جن خیالات کا ذکر کیا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ ادب پر معاشرے کے اثرات کے ہی نہیں بلکہ ادب سے معاشرے کی تنظیم وتربیت کے بھی قائل تھے۔انہوں نے حافظ اور سعدی کی فنکارانہ عظمت کا اقرار کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی صوفیانہ غزلوں کو بد اخلاقی پھیلانے کے لئے یک گونہ موردالزام ٹھہرایا ہے کیونکہ ان کے سبب اخلاقی کوتاہی،مردم بیزاری اور کم حوصلگی کی راہ ہموار ہوئی اگرچہ ان صوفی شعراء کا مقصد یہ نہ تھا لیکن صوفیانہ خیالات مجازی پیرایہ میں ہی ظاہر کئے گئے تھے اور حاؔلی کے نزدیک ان سے پست حوصلہ اور بوالہواس اشخاص کو دل بہلانے اور جواز پیدا کرنے کا بہانہ ہاتھ آ گیا۔ چنانچہ یہ غزلیں کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی شکل میں معاشرے کی پستی کی ذمہ دار بن گئی تھیں۔

حاؔلی سے قبل اُردو نثر کا موضوع زیادہ وسیع نہ تھا اس میں فقط قصّے،کہانیاں اور مذہبی کتابیں ہی لکھی جاتی تھیں حالانکہ حاؔلی نے بھی ابتداء میں مذہبی کتابیں ہی لکھی ہیں مثلاً تریاقِ سموم،مولود شریف وغیرہ۔حاؔلی سے قبل کسی کا ذہن اس طرف نہیں گیا کہ علمی خیالات کو اُردو زبان میں ادا کئے جائیں۔ حاؔلی نے ایک طرف تو قدیم مشرقی ماحول میں پرورش پائی تھی۔اور دوسری طرف وقت کی ضرورتوں اور زندگی کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے اپنے آپ کو جدید حالات سے مانوس کرنا پڑا۔نثر نگاری میں حاؔلی نے ادبی تنقید اور سیرت نگاری کو اپنے یہاں خاص جگہ بخشی ہے۔حاؔلی کی نثر میں وضاحت، استدلال،اعتدال،توازن کے ساتھ ساتھ سلاست وروانی کی بھی فراوانی ہے۔

اُردو میں سوانح نگاری کا باضابطہ آغاز خواجہ الطاف حسین حاؔلی (۱۸۳۷۔۱۹۱۴) کے ذریعے ہوا۔حاؔلی نے سوانح نگاری میں ایک ایسی منفرد اور جداگانہ راہ اختیار کی جوان سے قبل کسی نے اختیار نہ کی تھی۔ وہ صرف اپنے ہیرو کی خوبیاں اوراس کی زندگی کے واقعات بیان کرنے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ اس کی زندگی پوری زندگی اور کردار پر تبصرہ کرتے ہیں۔حاؔلی کی سوانح نگاری کی روش اس قدر مقبول عام ہوئی کہ ان کے بعد آنے والے تمام اہل قلم نے سوانح نگاری کی اس روش کو اپنانا شروع کر دیا۔حاؔلی نے اُردو میں سب سے پہلے نئے طرز کی سوانح عمریاں لکھی ہیں۔انہوں نے قریب اور بعید دونوں طرح کی شخصیات کو اپنا موضوع بنایا ہے اور تین سوانح عمریاں یادگار چھوڑی ہیں۔

(۱) حیاتِ سعدی (۲) یادگارِ غالب (۳) حیاتِ جاوید

(۱) **حیاتِ سعدی** : سعدی شیرازی اپنے عہد کے بہترین غزل گو شعراء میں شمار ہوتے تھے۔صداقت،جذبات اور سادگی بیان کے لحاظ سے آج بھی ان کی غزلیں بے مثال ہیں اور یہی وجہ ہے کہ فارسی میں ان کو غزل کا پیغمبر مانا گیا۔شیخ سعدی کی شخصیت اس قدر رنگارنگ تھی کہ واعظ بھی تھے،عالم بھی تھے،معلم اخلاق بھی تھے،عاشق بھی تھے اور قلندر بھی۔تعصّب سے پاک،ریاکاری سے گریزاں انسان دوستی کے مبلّغ،جاہ ومنصب سے بے نیاز اور ہوس دشمن۔ایسے بے پرواخرام شخص کے یہاں نہ باتوں میں ہیر پھیر ہوا کرتا ہے نہ تحریر میں۔ان کی شخصیت کی طرح ان کا انداز تحریر بھی تکلفات سے پاک ہے ۔سادہ وصاف، بہتے پانی کی طرح شفّاف۔

یہ حقیقت ہے کہ شیخ سعدی کے کلام پر حالی کا تبصرہ قابل قدر ہے انہوں نے جن محاسن کو نمایاں کیا ہے وہ کلام سعدی کی جان ہیں۔ جگہ جگہ ایسے نکات بتاتے چلے گئے ہیں جن سے ان کی قابل رشک سخن فہمی اور سخن سنجی پر ایمان لانا پڑتا ہے۔

الطاف حسین حالی کی یہ کتاب ''حیاتِ سعدی'' دو باب اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں حالی نے شیخ سعدی کی سوانح عمری لکھی ہے جس میں انہوں نے فارس اور شیراز کا حال بیان کیا ہے، شیخ کا نام، نسب، ولادت اور بچپن کا حال بیان کیا ہے اس کے بعد ان کی تعلیم کے بارے میں بتایا ہے پھر شیخ کی سیاحت کا حال بتایا ہے اور پھر اس باب کے آخر میں شیخ سعدی کا سفر کے بعد اپنے وطن واپس آنے کے بارے میں بیان کیا ہے۔ اس کتاب کے دوسرے باب میں حالی نے سعدی کی تصنیفات کا مفصل ذکر کیا ہے اس کے بعد آخر میں خاتمہ ہے جس میں حالی نے شیخ سعدی کے عام حالات اور ان کی عام شاعری پر اجمالی نظر ڈالی ہے۔

(۲) یادگارِ غالب : مرزا اسداللہ خاں غالب کی پہلی سوانح عمری ''یادگارِ غالب'' ہے۔ اس کتاب کو ایک ایسے انسان نے لکھا تھا جو غالب کے بہت قریب تھا، ان کو اچھی طرح جانتا تھا، اس زمانے کی دہلی کے ادبی، تہذیبی اور تاریخی حالات سے بھی بہ خوبی واقف تھا اسی وجہ سے یہ کتاب ایک منفرد کتاب مانی جاتی ہے۔ حالی کو غالب سے شاگردی کی نسبت حاصل تھی اور اس طرح تعلق خاطر اور ہمدردی کا وہ جذبہ بھی موجود تھا، جس کے بغیر اچھی سوانح عمری نہیں لکھی جا سکتی اور مختلف حالات کو صحیح پس منظر میں نہیں دیکھا جا سکتا۔

یادگار غالب کی ایک اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ حالی نے غالب کی شاعرانہ عظمت پر اس طرح روشنی ڈالی ہے کہ ان کی شاعری کی تمام اہم خصوصیات اُجاگر ہو گئی ہیں۔ حالی نے ایسے نکات کی طرف پہلی بار توجہ دلائی ہے جن سے واقفیت کے بغیر کلام غالب کے شعری محاسن کو پوری طرح سمجھنا مشکل ہے یہی وجہ ہے کہ ارباب عالم اور اہل نظر نے بار بار یہ کہا ہے کہ حالی کی یہ کتاب آج بھی بے مثل ہے۔

یادگار غالب پہلی بار ۱۸۹۷ء میں رحمت اللہ رعد کے اہتمام سے نامی پریس کانپور میں چھپی تھی۔ یہ کتاب دو حصّوں میں تقسیم کی گئی ہے پہلے حصّے میں غالب کی زندگی کے واقعات اور ان کے اخلاق و عادات و خیالات کا بیان ہے انہیں حالات کے ضمن میں ان کی خاص خاص نظمیں یا اشعار جو کسی واقعہ سے علاقہ رکھتے ہیں، اور ان کے لطائف و نوادر جن سے مرزا کی طبعیت کے اصلی جوہر ظاہر ہوتے ہیں اپنے اپنے موقع پر ذکر کئے گئے ہیں۔ دوسرے حصّے میں مرزا کے تمام کلام نظم و نثر اُردو اور فارسی کا انتخاب، اور ہر قسم پر جدا جدا ریویو، اور آخر میں مرزا کے کسی قدر کلام کا موازنہ ایران کے بعض مسلّم الثبوت استادوں کو کلام کے ساتھ کیا گیا ہے۔ پھر آخر میں خاتمہ ہے جس میں مرزا غالب کی تمام زندگی اور ان کی طرز شاعری و انشا پردازی پر ایک مختصر ریویو دیا گیا ہے۔

(۳) حیاتِ جاوید : حیاتِ جاوید میں حالی نے سرسید احمد خاں کی سوانح عمری لکھی ہے اور اس کو لکھ کر انہوں نے اس ملک پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ حالی کی سرسید احمد خاں سے پہلی ملاقات ۱۸۶۷ء میں سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ کے سالانہ جلسہ میں ہوئی تھی۔ حالی کو یہاں پہلی بار ایک ایسے شخص سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا جو ایک دشوار اور مشکل راہ پر چل رہا تھا۔ حیات جاوید کو حالی نے سرسید کے انتقال کے بعد مکمل کیا۔ یہ حالی کی سات سالہ ذہنی کاوشوں کا نتیجہ ہے یہ کتاب ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے جو ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئی۔ حالی نے اس کو سرسید کے سامنے ہی لکھنا شروع کر دیا تھا۔ مگر انہوں نے کبھی سرسید کو نہ دکھایا اور نہ ہی سرسید نے اس کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ حیات جاوید کو لکھنے کا حالی کا مقصد یہ تھا کہ وہ ایسے شخص کو کہ ''جس نے چالیس سال تک مسلسل تعصّب و جہالت کا مقابلہ کیا ہے، تقلید کی جڑ کاٹی ہے، بڑے بڑے علمائے مفسرین کو للکارا ہے، اماموں اور مجتہدوں سے اختلاف کیا ہے، قوم کے پکے پھوڑوں کو چھیڑا ہے اور ان کو کڑوی دوا پلائی ہے، جن کو مذہب کے لحاظ سے ایک گروہ نے صدیق کہا تو دوسرے نے زندیق خطاب دیا ہے اور جس کو پالیٹکس کے لحاظ سے کسی نے ٹائم سرور سمجھا ہے۔ ایسے شخص کی زندگی چُپ چاپ کیوں کر لکھی جا سکتی ہے؟ ضروری ہے کہ اس کا سونا کسوٹی پر کسا جائے اور اس کا کھرا پن ٹھونک بجا کر دیکھا جائے۔ وہ ہم میں پہلا شخص ہے جس نے مذہبی لٹریچر پر نکتہ چینی کی بنیاد ڈالی ہے۔ اس لئے مناسب ہے کہ سب سے پہلے اس کی لائف سے اس کی پیروی کی جائے اور نکتہ چینی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ دیا جائے''۔ لوگوں کے سامنے ان کے محسن کی سیرت

لاسکیں۔

حالؔی کوسرسید کی سوانح عمری لکھنے کا خیال پہلے پہل اس وقت پیدا ہوا تھا جبکہ وہ اپنے سب سے بڑے اور سب سے زیادہ مفید کام کی بنیاد ڈال چکے تھے۔ مدرستہ العلوم علی گڑھ میں قائم ہو چکا تھا اور باوجود سخت مخالفتوں کے بہت تیزی کے ساتھ ترقی کرتا جا تا تھا اور اسی کے ساتھ تہذیب الاخلاق میں سرسید کی دلنشیں تحریریں جیسی کہ اُردو زبان میں پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی تھیں، شائع ہو رہی تھیں۔ اگر چہ سرسید نے اپنی زندگی عام بھلائی کے کاموں میں مدت سے وقف کر رکھی تھی مگر ابھی تک ان کا حال پہلی رات کے چاند کی مانند تھا کسی نے دیکھا اور کسی نے نہ دیکھا لیکن مدرستہ العلوم اور تہذیب الاخلاق نے ان کی کوششوں کو چودھویں رات کے چاند کی مانند سب پر روشن کر دیا۔ اگر چہ قوم میں عموماً مخالفت پھیلی ہوئی تھی مگر ایک گروہ ایسا بھی تھا جو سرسید کے کاموں کو نہایت عظمت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ حالؔی کے دل میں بھی ان کی وقعت روز بروز زیادہ ہونے لگی۔ اسی وقت سے حالؔی نے کچھ نوٹ ان کی لائف کے متعلق قلمبند کرنے شروع کر دئے۔ سرسید کے ایک نہایت خالص و مخلص دوست آنریبل حاجی اسمٰعیل خان رئیس دتاولی کو یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ معزز لائف جہاں تک جلد ممکن ہو اُردو زبان میں مکمل طور پر لکھی جائے چنانچہ ان کی تحریک سے حالؔی کے دوست منشی سراج الدین احمد مالک سرسید کی لائف لکھنے پر آمادہ ہوئے۔ انہوں نے بڑی کوشش سے اس کے لئے مٹریل جمع کیا اور ایک خاص حد تک اس کو ترتیب دے کر حاجی صاحب کو دیدیا۔

یہ کتاب بہ نظر سہولیت دو حصّوں میں تقسیم کی گئی ہے پہلے حصّے میں چھ (۶) باب ہیں۔ پہلا باب ۱۸۱۷ء سے ۱۸۳۸ء تک ہے جس میں سرسید کی تاریخ ولادت اور خاندان کے بارے میں، بچپن، تعلیم اور ان کی جوانی کے بارے میں بیان کیا گیا ہے۔ دوسرا باب ۱۸۳۸ء سے ۱۸۵۷ء تک ہے جس میں سرسید کی ملازمت کے بارے میں بیان کیا گیا ہے۔ تیسرا باب ۱۸۵۷ء سے ۱۸۶۸ء تک ہے۔ چوتھا باب ۱۸۶۹ء سے ۱۸۷۰ء تک ہے۔ پانچواں باب ۱۸۷۰ء سے ۱۸۷۸ء تک ہے اور چھٹا باب ۱۸۷۸ء سے ۱۸۹۸ء تک ہے جس میں ان کی زندگی کے تمام واقعات اور ان کے کام ابتداء سے اخیر تک ترتیب وار بقید تاریخ بیان کئے گئے ہیں اور ورکس پر ریویو کیا گیا ہے۔ سرسید کی زندگی کا زیادہ نمایاں حصہ جو غدر کے زمانے سے شروع ہوتا ہے اس کے متعلق زیادہ تر حالات علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، تہذیب الاخلاق اور تصانیف احمدیہ سے لئے گئے ہیں اور بہت سی اطلاعیں سرسید کے دوستوں کی زبانی یا خود سرسید کے خطوط سے جو انہوں نے اپنے دوستوں کو وقتاً فوقتاً لکھے، یا سرکاری رپورٹوں، انگریزی اخباروں اور بعض مدبران سلطنت کی تحریروں سے جن میں سرسید کا ذکر کیا گیا ہے اور بعض اور معتبر ذریعوں سے جن کی ہر ایک موقع پر تصریح کر دی گئی ہے، حاصل ہوئی ہے۔

کتابیات

(۱) افکارِ حالؔی، مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اُردو، کراچی، ۱۹۷۶ء

(۲) تذکرۂ حالؔی، شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، لاہور، ۱۹۵۴ء

(۳) حالؔی کا سیاسی شعور، معین احسن جذبی، قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۱۱ء

(۴) حالؔی کی اُردو نثر نگاری، ڈاکٹر عبدالقیوم، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۴ء

(۵) حیات جاوید، الطاف حسین حالؔی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۱۹۹۹ء

(۶) حیات سعدی، خواجہ الطاف حسین حالؔی، مارچ ۱۹۹۲ء

(۷) کلیات نثر حالی، شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، لاہور، ۱۹۶۷ء

(۸) مقالات حالی، مرتب عبدالحق، انجمن ترقی اُردو ہند، علی گڑھ، ۱۹۵۷ء

(۹) یادگار حالؔی، صالحہ عابد حسین، دہلی، ۱۹۵۰ء

(۱۰) یادگار غالب، شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالؔی، مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی، طباعت دوم، اگست ۲۰۱۲ء

☆☆☆

تفتہ اور انکا فارسی کلام کا ایک مختصر جائزہ

شاکرہ طلعت، شعبہ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ھندوستان میں جب مغل حکمراں زوال پزیر ہو رہے تھے اس وقت یہاں فارسی زبان وادب میں مسلم قوم کے علاوہ ہندو قوم اور خاص کر کایستھوں نے فارسی میں اپنا ایک الگ مقام قائم کیا۔ان میں ہرگوپال بھٹنا گر سکندرآبادی کا نام سرفہرست ہے جنھوں نے اس دور مین فارسی زبان و ادب کا چراغ روشن رکھا اور اردو زبان کے عروج کی پروا کئے بغیر انہوں نے فارسی کو اردو پر فوقیت دی اور اپنے استاد کی طرح اس کی سرپرستی کرنا اپنا فرض سمجھا۔

حیات زندگی:

سکندرآباد ضلع بلند شہر کی بنیاد سکندر لودی نے ڈالی تھی یہ دلی سے ۴۰۔۴۵ میل شمال کی طرف واقعہ ہے۔اس زمانہ میں یہاں کایستھوں کا ایک مشھور خاندان سکونت پزیر ہوا اور اپنی صلہ میں موروثی عہدہ قانون گوئی سے سرفراز ہوا تھا منشی ھرگوپال تفتہ اس کاندان کے چشم چراغ تھے صبح گلشنکے مولف کے مطابق یہ برہمن قوم سے تعلق رکھتے تھے جیسے کہ وہ اس عبارت میں بیان کرتے ہیں جو حسب ذیل ہیں۔

''منشی ہرگوپال از قوم برہمن متوطن اضلاع شاہ جہاں آباد واز ارشد تلامذہ میرزا اسداللہ خاں غالب دہلوی والا نژاد ست''[۱]

تفتہ کی سال پیدایش ۱۲۱۴ھ سکندرآباد میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم گھر پر اپنے والد کے زیر نگراں شروع ہوئی بچپن سے ہی فارسی سے بے حد انسیت تھی اور اس کی وجہ سے انہوں نے اپنی ذاتی کوششوں سے فارسی سیکھی اور مختلف شاعروں کا دیوان بھی گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا۔ بزم غالب کے مصنف '' نشتر عشق'' کے حوالے سے بیان کرتے ہیں۔

''کہ نورالعین واقف بٹالوی کے دیوان کے مطالعے نے ان کے دل میں شعر گوئی کا ذوق پیدا کر دیا چونکہ دکاوت اور استعداد سے بہرہ وافر ملا تھا اس لیے تھوڑی سی توجہ اور مشق سے بہت جلدی ترقی کر گئے''[۲]۔

تفتہ کے پہلے استاد کے متعلق تمام تذکرے خاموش ہیں لیکن گلشن ہمیشہ بہار میں مصنف کے بقول: ''۔۔۔۔۔مولدش چکلہ سکندآباد در محلّہ قانون ۔۔۔۔تلمیذ مرزا قتیل است''[۳] مندرجہ بالا عبارت سے یہ ثابت ہوتی ہے کہ قتیل ان کے استاد تھے شروع میں وہ رامی تخلص رکھتے تھے جیسا کےِ اس شعر سے ظاھر ہوتا ہے:

رامی تو کز غمت بیمار بود — عاقبت امروز از دنیا گذشت
زرامی تو چو ما سرگذشت پرسیدم — کشید آہ گریباں درید و ھیچ نگفت

استاد قتیل کے انتقال کے ایک عرصہ بعد وہ غالب کے شاگرد ہوئے۔ غالب کی شاگردی میں کب آئے اس کے زمین کوئی ثبوت کسی بھی تذکرے میں نہیں ملتا۔ان کے شاگردی میں آکر انہونے اپنے استاد کی طرح اپنا پہلا تخلص رامی سے بدل کر تفتہ رکھ لیا اور مرزا غالب نے انھیں مرزا کا خطاب دیکر ''مرزا تفتہ'' بنا دیا اور وہ غالب کے محبوب شاگردوں میں سے تھے۔انہوں نے اپنے استاد کی تہذیب اور تحسین میں کوئی فروگذاشت نہیں کیا۔

تفتہ کو فارسی میں اس قدر دلچسپی تھی کے انہوں نے عہدہ قانون گوئی جو برسوں سے انکے خاندان کی وراثت تھی اسے ترک کر دیا اور تمام عمر فارسی میں وقف کر دیا وہ لطیف مزاج اور آزاد منش شخصیت کہ مالک تھے۔تفتہ کی ازدواجی زندگی کامیاب رہی اللہ نے انہیں تین اولاد سے نوازہ تھا اس میں دولڑکے امراؤ سنکھ اور پیتمبر سنکھ اور ایک لڑکی تھی چھوٹے بیٹے اور لڑکی کی وفات انکی زندگی میں ہوگئی۔اپنے چھوٹے بیٹے کی وفات پر انہوں نے ایک طویل

مرثیہ لکھا۔ اس میں اپنی دلی کیفیت اور تڑپ پر درد الفاظ کے پیرائے میں بیان کیا ہے ۔ یہ مرثیہ ۱۲۲ اشعار پر مشتمل ہے اور ان کے دیوان دوم میں درجہ ہے ان کے چند اشعار حسب ذیل ہیں۔

زفرزندانم آں فرزند کوچک　　که پتمبر ہے خواندیش ہر یک
چہ پتمبر در امر خیرساعی　　چہارم مصرعے بود از رباعی
چہ پتمبر عزیز مصر جانہا　　زلیخا متاعش کاروانہا
چہ پتمبر چراغ خانہ من　　دل من جان من جانانہ من ؎

اور اپنے تصنیف ''تضمین گلستان'' اپنے بیٹے پتمبر کی یاد میں نظم کیا ہے ۔ اپنے ان اولادوں کا غم وہ برداشت نہ کر سکے اور آخر کار ۲ ستمبر ۱۸۸۹ء میں سکندر آباد میں دنیا فانی کو الوداع کہا۔ بدری کرشن فروغ نے عیسوی اور مولوی مختار احمد تھانوی نے ہجری میں ان کی تاریخ وفات کہی ہے۔ ملاحظ ہو۔

سال نقلش بادل زار از خرد
من شنیدم بے سروپا شد سخن (۱۳۹۶ھ)۵؎

غالب اور تفتہ:

منشی ہر گوپال تفتہ سے مرزا غالب کے بہت اچھے مراسم تھے یہ غالب کے ہر دل عزیز شاگرد اور دوست بھی تھے جس کا ذکر تمام تذکرہ نگاروں نے کیا ہے۔ منشی تفتہ سے غالب کو بہت انسیت تھی اس بات کا ثبوت غالب کے بشمار خطوط ہیں جن کی تعداد ۱۲۳ ہے جو انہوں نے تفتہ کو لکھے ہیں۔ غالب نے تفتہ کے شعری اصلاح میں بھی مدد کیا ہے یہ ایک روشن ضمیر استاد کی پہچان ہے کہ وہ ہر ممکن اپنے شاگرد کی مدد کریں غالب نے بھی یہ ہی کیا انہونے کبھی بھی تفتہ کے کلام پر اصلاح دینے میں بخل اور غیر معمولی تاخیر سے کام نہیں لیا اس سبب کی وجہ سے وہ اپنے تمام احباب اور شاگردوں میں عظمت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کے دوسرے شاگردوں کی طرح تفتہ نے غالب کی معاسی امداد بھی کی ہے۔ تفتہ نے غالب کی وفات پر ترجیع بند نظم کیا جس کا یک مصرعہ حسب ذیل ہے۔

از یں جملہ بر تریکی اہل دل
خوش آزاد مردے بجق مشتعل
اسد نام غالب تخلص ہمی
ز آگہ دلی ہانہ غافل دمی

تفتہ کی شاعری:

منشی ہر گوپال تفتہ کا فارسی کلام بلند پایے کا ہوتا تھا۔ سبک ھندی کے بہت بڑے پیرو کار تھے۔ جس سے سن کر اہل زبان ستایش کرتے تھے۔ انکی کلام کی سب سے بڑی خصوصیت رنگین بیانی ہے۔ عشق محبت، دیروحرم، خوشی وغم، جفا وفقا، تدبیر اور تقدیر وغیرہ فرسودہ اور پیش افتادہ مضامین ہیں۔ انہوں نے اپنی غزلوں میں تمام روایتوں کو بخوبی نبھایا ہے۔ مثلاً انہوں نے ظہوری، نظیری، صائب، حافظ وسعدی وغیرہ کا طرز سخن اپنایا اور ان کی پیروی میں تین گنے اشعار کہے ہیں اکثر ایک ایک زمین کے جواب میں تین تین غزلیں تک کہی ہیں اور اس کے حاشیہ پر اس غزل کا مطلع بھی درج کر دیا ہے جس غزل کے جواب میں یہ غزل کہی گئی ہے۔ تفتہ نے غالب کی غزل کے زمین میں بھی غزل کہی ہے اس کا ایک مصرعہ حسب ذیل ہے۔

غالب:　جلوہ سرکار جانفشانی ہا　　خندہ استاد کارروانی ہا
تفتہ کی پہلی غزل:　رایگا ہست زندگانی ہا　　میتوان کرد جانفشانی ہا

دوسری غزل کا مطلع: ازتوای جان کاروانی ہا دل ستانیست جا نشانی ہا

مطلع غزل سوم: اندہم بین بناتوانی ہا سکیہای من گرانی ہا

انکا فارسی کلام:

تفتہ نے چار دیوان اور تین منظوم کتابیں اپنی یادگار چھوٹی ہے اس میں تضمین کریما، تضمین گلستان اور سنبلستان شامل ہیں ان کے دیوان کی تعداد میں بعض تذکرہ نگاروں کے یہاں اختلاف ہے۔صبح گلشن۶ کے مولف نے پانچ دیوان کی اطلاع دی ہے جب کی یہ دورست نہیں ہے۔

دیوان اول:

یہ دیوان ان کی ابتدائی فارسی کلام پر مشتمل ہے۔ جو ۱۸۴۷ء میں پہلی مرتبہ مرتب ہوا۔اسعد الاخبار(آگرہ) میں طباعت دیوان کا اشتہار ملتا ہے۔اور اس میں تقریباً پچاس سال کی عمر تک کا کلام جمع ہے۔اس دیوان کا دیباچہ تفتہ کی فرمایش پر مرزا غالب نے لکھا تھا اور یہ مطبوعہ میں شامل ہے۔''پنج آہنگ اور کلیات نثر غالب اور تفتہ اور غالب''میں بھی''دیباچہ منشی ہرگوپال تفتہ''کے عنوان سے درج ہے۔اس میں غزلوں کی ترتیب تفتہ نے غالب کے مشورے کے مطابق دی ہے۔''انہوں نے مشورہ دیا کہ مرزا بیدل (متوفی ۱۱۳۳ھ) دیوان غزلیات کہ ہر زمین میں دوغزلیں کہیں ہیں اور ان غزلوں کے درمیان ایک مختلف زمین کی غزل رکھی ہے۔اچھا ہو کہ تم بھی اس ترتیب سے اپنا دیوان مرتیب کرو'۔اور جب اس دیوان کی اشاعت پر غالب کی نظر پڑی تو اس کی ترتیب دیکھکر بہت خوش ہوئے۔اس میں عرفی،صایب،محتشم کاشانی،جامی اور عراقی کے زمین میں غزلیں کہیں ہیں۔

دیوان دوم:

یہ دیوان ظاہراً ۱۸۵۴یا ۱۸۵۵میں مرتب ہوگیا تھا۔دوبارہ تفتہ نے فرمائش کی کہ دیوان اول کی طرح اس دیوان پر بھی دیباچہ وتقیر یظ لکھ دیں لیکن وہ انکی فرمائش پوری نہ کرسکے اس کی طباعت قدیم ہے،کتابت روشن اور واضع ہے اور کاغذ دبیز اور لعب دار اور تقطیع کلاں،تعداد صفحات ۵۹۳+قطعات تاریخ ۶صفحات پر مشتمل ہے یہ کوہ نور پریس لاہور سے ۱۸۵۷میں با اہتمام منشی سکھ رائے طبع ہوا۔اس دیوان کے مطبوعہ نسخہ رامپور رضا لابیریری،برٹیش میوزیم،علی گڑھ مولانا آزاد لابیریری کے حبیب گنج کلکشن اور دوسرے کتب خانہ میں موجود ہے۔اس کا ایک نسخہ مالک رام کہ پاس بھی تھا جواب مالک رام کی وصیت پر حکیم عبدالحمید مرحوم کی ہمدرد یونیورسیٹی دھلی میں محفوظ ہے۔اس میں مرزا جلال اسیر،عراقی،حافظ،امیر خسرو، ظہوری قزلباس خاں امید وغیرہ کی طرز پر غزلیں لکھی ہیں۔

دیوان سوم :اس کے متعلق کسی نے کوی اطلاع نہیں دیا اور نہ اس کا کوی نسخہ ابھی تک دستیاب ہے۔صبح گلشن اور روز روشن ۷کے مولف کی نظر میں اس کا ایک قلم یا مطبوعہ نسخہ گزرا ہے۔ تلامذہ غالب میں مالک رام نے صرف اتنا لکھا ہے کہ ''تیسرے دیوان تمام اخلاق،معانی کمال،اسماعیل اصفہانی کی زمینوں میں ہے اور کسی جگہ فارسیت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا''۷

دیوان چھارم: اس دیوان کے بارے میں پروفیسر مختارالدین احمد نے تحریر کیا ہے۔''اس دیوان کا ایک ہی ایڈیشن کے تین مطبوعہ نسخے راقم کی نظر سے گزرے ہیں لیکن سرورق تینوں میں غایب ہیں اس لیے یہ پتا نہیں چلتا کہ کب اس کی اشاعت ہے'' اس دیوان میں غزلیات ہیں اور زیادہ تر غزلیں مرزا جلال اسیر اصفہانی کی زمین ،قوامی اور ردیف میں لکھی گئی ہیں۔دیوان کہ مطبوعہ کے حاشیہ پر اسیر کی غزلوں کا مطلع درج کردیے گئے ہیں۔ان کی پہلی غزل کا مطلع:

اے گلخن ازمروت عشق تو سینہ بال سمندراز کف خویت سفینہ ہا

آخر غزل کا مقطع:

گرکنی دیوان جارم ھم بدین خوبی تمام تفتی دیوان قضارا چون نہ سروفتر شوی

یہ دیوان ۲۶۴ صفحات پر مشتمل ہے اور اس کا مکمل نسخہ ھارڈنگ لائبریری دھلی میں موجود ہے۔صفحات کی تعداد ۲۴۳،تقطیع ساڑھے گیارہ

انچ ساڑھے سات انچ اور مطبع خلایق آگرہ سے چھپ کر شائع ہوا۔

تضمین کریما: کریما کہ ہر شعر پر تفتہ نے تین مصروں کا اضافہ کر کے مخمس کی شکل میں مرتب کیا ہے۔ مطبع خلائق آگرہ سے ۱۸۵۹ء/۱۲۷۵ھ شائع ہوا تعداد صفحات ۲۸ ہے۔ اس کے متعلق کچھ خاص معلمات فراہم نہ ہوسکا۔

تضمین گلستان:

شیخ سعدی کی گلستان کے جواب میں لکھا ہے۔ اس زمانہ میں گلستان کی ہر بیت زبان و دعوام وخواص پر تھی اس لئے انہونے اس کی تضمین لکھنے کا سوچا اور آٹھ ہفتوں میں تضمین گلستاں تیار ہوئی اس کو اپنے بیٹے کی یاد میں نظم کیا۔ یہ گلستان سعدی کی طرح پند ونصیحت اور تہذیب اخلاق پر مبنی ہے اور اسی کی طرح تمام حکائتوں اور مثالوں کا مقصد ادب، تربیت اور تہذیب نفس ہے یہ آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔

باب اول: کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ بادشاہ رنجور کا عنوان کے پیرائے میں ہرمز اور سیاہ گوش کی حکایت مثنوی کی شکل میں بیان کیا ہے۔

باب دوم: حکایت دو بزرگاہ کے نام سے ہے اور اس میں عبدالقادر جیلانیؒ کے بابت حکایت درج کی ہے اور یک قطعہ بہ تضمین استیانت دو قطعہ بہ تضمین استعانت کے نام سے ہے۔

باب سوم: یہ حکایت سخاوت پر مبنی ہے اس میں حاتم طائی کی سخاوت اور حضرت موسیٰ کی درویشی کا بیان ہے۔

باب چہارم: خاموش آواز کے زمین میں لکھا ہے۔

باب پنجم: صاحب جمال درگذشت کے عنوان پر لکھی ہے۔

باب ششم: باطائفہ دانشمنداں

باب ہفتم: جدال سعدی کے عنوان سے نظم کیا ہے۔

باب ہشتم: رباعیات اور ایک قطعہ بہ تضمین استعانت کے نام پر لکھی ہے۔

تضمین کا آغاز وہ کچھ اس طرح کرتے ہیں۔

تنہا نہ من و عذر کہ شکرش
کے ازمن کو تہ نظر آید
دروہم و گمان کہ بگنجد
از دست و زبان کہ بر آید

سب سے پہلے مطبع مفید خلائق آگرہ سے ۱۸۵۸ء میں شائع ہوئی اس کا ایک نسخہ کتب خانہ رامپور رضا لائبریری میں محفوظ ہے اس کی دو اشاعت ہیں ایک قدیم اور دوسری کی ۱۲۷۴ھ تعداد صفحات ۲۵۲، سطور فی صفحہ ۱۹ سرورق اور آخری صفہ غایب ہے اس لیے مطبع اور مقام کا پتا نہ ہوسکا۔

سنبلستان:

یہاں عرض کر دینا ضروری ہے کہ اسی ۱۹ صدی میں کم از کم دو شعراء بھی بوستان کی پیروی میں مثنویاں نظم کی ہیں ایک الفت شاہ فریاد ہیں اور انکی تصنیف ''دبستان اخلاق'' ہے اور دوسرا بخش اللہ نامی و بنی اسرائیل اس کا عنوان ''گل بوستان'' نام سے ہے۔ فارسی زبان ادب کا دور اول میں تفتہ نے بوستان سعدی کی تتبع میں اس مثنوی کو نظم کیا اور غالب کی تجویز پر اس کا نام سنبلستان رکھا اور جو خود اپنے آپ میں ایک عظیم کارنامہ ہے، اس کی تحریر سہل زبان، روان انداز بیان، پند ونصائح کے بیان صراحت اور محبت وخلوص وغیرہ سنبلستان کی وہ خصوصیت ہیں جن کی وجہ سے تفتہ کہ اس مثنوی کو بوستان سعدی کی جواب میں ایک کامیاب کوشش کہا جاسکتا ہے۔

سنبلستان بعض لحاظ سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں قدیم معاصر شعراء کے درمیان چشمک، معاصر دور کی سماجی اور ادبی حالات

مصنف نے استاد غالب دہلوی کے حالات اور ان کے کلام پر تبصرہ کیا ہے جو مصنف کے بعض احوال و آثار متعلق اہم معلومات ہیں اس مثنوی کے آخر میں انہوں نے اپنے بڑے صاحبزادے امراؤ سنگھ کی شکایت تحریر کی ہے۔ ادبیات فارسی ہندوں کا حصہ ڈاکٹر سید عبداللہ نے لکھا ہے کہ سنبلستاں کا دوسرا ایڈیشن نولکشور پریس سے ۱۸۶۰ء میں اور سنبلستان تفتہ کے بقول ۱۲۷۷ میں مکمل ہوا جو میرٹھ سے شائع ہوئی اس وقت تفتہ کی عمر ۶۸۔۶۹ برس تھی اور ان کی سنبلستان دوازدہ ائمہ کی مناسبت سے بارہ ابواب پر مشتمل ہے انہوں نے اس کا آغاز حمدِ باری اور نعت رسول سے کیا ہے۔

به نام خدای جهاں آفرین زمین آفرین آسمان آفرین
بهر ذره مهر و بهر سایه نور بهر نور او صد تماشای طور

باب اول: خدا کی حمد و ثنا، حکایت از محمد ﷺ پھر دوسری حکایت علیؑ مرتضیٰؓ تیسری حکایت ابوبکر صدیقؓ چھوتھی حکایت حضرت ابوحنیفہ اور آخری بایزید بسطامی کا ذکر مثنوی کی شکل میں بیان کی ہے۔ باب دوم: در ظرافت، باب سوم: در حسد، باب چہارم، باب پنجم: در شعر و شاعری، باب ششم: در راستی، باب ہفتم: در مذمت حست، باب نہم در عشق، باب دہم در ذکر موت، باب یازدہم در انتقام، باب دوازدہم در ذکر مصنف، باب سیزدہم در خاتمہ کلام

خلاص کلام یہ کہ ۱۹ وصدی میں انہوں نے گلستان کا تضمین اور سنبلستان نظم کیا جو اس دور میں سنگ میل کی حثیت کا حامل ہے۔ تفتہ نے شیخ سعدی کے دونوں عظیم کارنامہ کو دوبارہ لوگوں کی زبان اور زہن میں تازہ کر دیا۔

حواشی:

۱ صبح گلشن، مولف سید علی حسن خان ،ص ۸۶۔۸۷ ۲ :بزم غالب ، مولف عبدالروف عروج ،ص ۱۱۴ ۳: گلشن ھمیشہ بھار ، نصراللہ خاں خویشگی ،ص ۶۸ ۴ : دیوان دوم ، تفتہ ، ص ۱۱۲ ۵ : تفتہ اور غالب ،ڈاکٹر محمد ضیاءالدین انصاری ،ص ۴۳ ۶ صبح گلشن ،سید علی حسن خاں ،ص ۸۶۔۸۷ ۷ تلامذہ غالب ، مالک رام ،ص ۶۳۔۶۵

کتابیات

۱۔ بزم غالب۔ مولفہ: عبدالروف عروج۔ مطبوعہ: ادارہ یادگار غالب۔ ۱۹۶۹ء
۲۔ تلامذہ غالب۔: مالک رام۔ مرکز تصنیف و تالیف نکود۔ ۱۹۵۷ء
۳۔ خمخانہ جاوید (جلد دوم)۔ لالہ سریرام۔ دفتر خمخانہ جاوید دہلی۔ ۱۹۱۱ء
۴۔ روزِ روشن۔ مظفر حسین صبا۔ شاہجہانی بھوپال۔ ۱۲۹۷ھ
۵۔ صبح گلشن۔ سید علی حسن خاں۔ شاہجہانی بھوپال۔ ۱۲۹۵ھ
۶۔ گلستان ہمیشہ بہار۔ نصراللہ خاں خویشگی۔ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی۔ ۱۹۲۷ء
۷۔ گلستان سخن۔ مرزا ا قادر بخش۔ مجلس ترقی ادب لاہور۔ ۱۹۶۶ء
۸۔ ہرگوپال تفتہ۔ پروفیسر ریحانہ خاتون۔ غالب اکیڈمی نئی دہلی۔ ۲۰۰۸ء
۹۔ تفتہ اور غالب۔ ڈاکٹر محمد ضیا الدین انصاری۔ غالب اکیڈمی نئی دہلی۔ ۱۹۸۴ء
۱۰۔ پنج آہنگ۔ مترجمہ: محمد عمر مہاجر کراچی۔ ادارہ یادگار غالب۔ ۱۹۶۹ء
۱۱۔ تضمین گلستان۔ تفتہ۔ کانپور نول کشور۔ ۱۸۷۳ء
۱۲۔ فیضان غالب۔ عرش ملسیانی۔ نئی دہلی غالب اکیڈمی۔ ۱۹۷۷ء
۱۳۔ سنبلستان۔ تفتہ۔ میرٹھ مطبع مرات الصحائف۔ ۱۲۷۸ء

☆☆☆

حضرت مجدد الف ثانی بحیثیت مدبر و مفکر دین وملت

صحام محیط، ریسرچ اسکالر، شعبۂ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ہندوستان کے مسلم عہد حکومت میں عام مسلمانوں کی سیاسی، مذہبی، ثقافتی اور روحانی زندگی کی نشونما سلاطین، علما اور صوفیا کرام کے زیر سایہ ہوئی مسلم بادشاہوں کی بدولت ہندوستان میں علما، صوفیا کو قدم جمانے اور اسلامی تعلیمات کو فروغ دینے کا موقع ملا۔ ان علما، صوفیا میں ایک طبقہ ایسا رہا ہے جس نے اسلام کی تبلیغ واشاعت اور اسکی ترویج وترقی میں خصوصی دلچسپی لی اور اپنی مستقل مصروفیات کے باوجود یہ خدمات انجام دیں۔ بعض علما نے وعظ وتذکیر کا مشغلہ اختیار کیا جن کو مؤرخین نے مذکرین وواعظین کے لقب سے یاد کیا ہے۔ مزید براں یہ دور ایسے ممتاز ومنفرد علما سے بھی خالی نہیں رہا جنھوں نے غیر اسلامی رسوم وروایات، بدعات اور معاشرہ کی اصلاح کو اپنا مقصد حیات سمجھا اور قرآن حدیث کی روشنی میں ان لغو وخرافات کو منسوخ کرنے کی کوشش کی۔ انھیں علما، فضلا اور مفکرین کامل میں سے ایک عظیم شخصیت حضرت مجدد الف ثانی کی ہے جنکی علمی لیاقت اور گوناگو صلاحیتوں سے ایسے بے شمار عظیم کارنامے وجود میں آئے جو امت مسلمہ کے لئے مشعل راہ اور صراط مستقیم کا ذریعہ ثابت ہوئے۔

حضرت مجدد الف ثانی سلسلہ تصوف اور سلسلہ نقشبندیہ کی وہ اعلی مرتبت شخصیت ہیں جن کو الف ثانی کا مجدد تسلیم کیا جاتا ہے۔ آپ نے قدیم رسم ورواج اور بدعتوں کی بیخ کنی کر کے راہ سنت کی وضاحت فرمائی اور خود راہ سنت پر ثابت قدمی کے ساتھ چلتے رہے اور حوادث زمانہ سے برسر پیکار رہے اور امت مسلمہ کی رہبری ورہنمائی کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ آپ کے سلسلۂ تصوف میں حضرت شاہ ولی اللہ اور حضرت سید شہید جیسے برگزیدہ اور خدارسیدہ لوگ شامل تھے۔ آپ کی ولادت جمعتہ المبارک کی شب ۱۴/شوال ۹۷۱ھ مطابق ۲۶/مئی ۱۵۶۴ء کو سرہند شریف (پنجاب) میں ہوئی[۱]۔ سال ولادت لفظ ''خاشع'' سے نکلتا ہے[۲]۔ آپ کا نام احمد تجویز ہوا، بچپن سے ہی آپ عام بچوں سے الگ تھے آپکے اندر رشد وسعادت کے تمام آثار نمایاں تھے۔ شیخ نسلاً افغان تھے۔ آپ کے والد ماجد شیخ عبدالاحد خود ایک عالم مرتبت اور صوفی بزرگ تھے ان کے بیان کے مطابق ان کا شجرہ نسب ۲۸/ واسطوں سے امیر المومنین حضرت فاروق اعظم عمر بن خطابؓ سے ملتا ہے[۳]۔

شیخ مجدد صغر سنی میں ہی حفظ قرآن کی دولت سے مشرف ہوئے اس کے بعد اکثر کتب درسیہ والد ماجد اور کچھ سرہند کے دوسرے علما سے پڑھیں۔ دینی تعلیم کی تکمیل مولانا کمال کشمیری سے حاصل کی۔ معقولات اور حدیث کی سند مولانا یعقوب صرفی سے لی۔ تفسیر، حدیث، ادب اور قصیدہ بردہ کا درس قاضی بہلول بدخشی سے لیا صرف ۱۷ ربرس کی عمر میں آپ تمام ظاہری وباطنی کمالات کے جامع ہو گئے۔ تحصیل علم سے فراغت کے بعد آگرہ تشریف لے گئے اور تمام طلبائے علوم کے لئے درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ یہاں ابوالفضل اور فیضی سے ملاقات ہوئی۔ دونوں بھائی آپ کا بہت احترام کرتے تھے۔ روایت مشہور ہے کہ فیضی کی 'سواطع الالہام' غیر منقوط تفسیر قرآن کی تالیف میں بعض مقامات پر آپ کی امداد شریک تھی۔ ۱۵۹۷ء میں آپ کا نکاح اکبر کے دربار کے ایک امیر شیخ سلطان تھانیسری کی صاحبزادی سے ہوا[۴]۔

جب راہ سلوک پر گامزن ہوئے تو سب سے پہلے سلسلہ چشتیہ میں اپنے والد بزرگوار سے بیعت ہوئے پھر طریقۂ قادریہ میں بھی بیعت لی۔ تعلیم طریقہ قادریہ اپنے والد سے حاصل کی ان کو شیخ کمال کتھیلی کے پوتے شاہ سکندر سے بھی سلسلہ قادریہ کا خرقۂ خلافت ملا تھا[۵]۔ آپ نقشبندیہ سلسلے کے بزرگ حضرت خواجہ باقی باللہ سے بھی بیعت ہوئے جنھوں نے آپ کے روحانی کمالات کا اندازہ لگا کر فرمایا کہ وہ ایسے چراغ ہیں جو آگے چل کر دنیا کو روشن کریں گے[۶]۔ خود شیخ مجدد کو اس بات کا اعتراف رہا کہ انھیں جو تجلیات، ظہورات، انوار اور ولدان کی نعمتیں حاصل ہوئیں وہ حضرت خواجہ باقی باللہ کی صحبت کا اثر تھا۔ یہ تمام فیوض وبرکات حاصل کرنے کے بعد درس وتدریس اور رشد وہدایت کا سرچشمہ بلند کیا جس سے ایک بڑا مذہبی اور روحانی انقلاب پیدا ہوا جسکی فضیلت اور کمالات کی روشنی سے کثیر تعداد میں لوگ سرشار ہونے لگے۔ آپ نے اپنے تجدیدی اور اصلاحی کارناموں سے اپنے عہد کے

مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلمانوں کو بھی ایک نئ زندگی دی۔آپکا ظہور اس وقت ہوا جبکہ اکبر بادشاہ کی بے دینی شباب پر تھی۔خودغرض اور چاپلوس پیشہ لوگوں نے اسے گھیر رکھا تھا۔غرض کہ پورے ملک میں بے دینی اور ضلالت وگمراہی کا دور دورہ تھا۔ایسے تاریک دور میں حضرت مجدد الف ثانی ایک ایسی شخصیت تھی جو اعلائے کلمتہ الحق میں مشغول تھی۔آپ نے دین اسلام کی اشاعت کی اور اکبر کو صحیح راستے پر لانے کی سعی کی مگر یہ تمام تر کوششیں موثر ثابت نہ ہو سکیں اور اکبر کا اسی درمیان ۱۰۱۴ھ میں وصال ہو گیا۔اس کے بعد جب جہانگیر بادشاہ بنا تو اس موقعہ کو غنیمت سمجھ کر شیخ مجدد نے اپنی اصلاحی کوششیں دوبارہ شروع کیں اور ان تمام رسوم وبدعات جو عہد اکبری میں پروان چڑھی تھیں انکے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔شیخ مجدد کے یہ کارنامے بطور جہاد بالقلم اور جہاد بالسان ظاہر ہوئے۔آپ نے اپنی رشحات قلم سے حسب ذیل تصانیف تحریر کی۔

(۱)رسالہ مبداء ومعاد (۲) معارف لدنیہ (۳) رسالہ در ردّ روافض (۴) رسالہ تہلیلیہ (۵) تعلیقات عوارف (۶) شرح رباعیات حضرت باقی باللہ (۷) مکاشفات غیبیہ (۸) مکتوبات امام ربانی۔آپ کے مکتوبات سب سے ضخیم ہیں جو تین جلدوں پر مشتمل ہیں۔انکی مجموعی تعداد تقریباً ۵۳۶؍ ہیں۔

ہندوستان کی سیاسی وتمدنی تاریخ میں سولہویں اور سترہویں صدی عیسوی کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے اس میں ذہنی انتشار اور معاشرتی بےچینی پھیلانے والی کئ تحریکیں اٹھیں جنکے ہندوستانی معاشرے پر گہرے اثرات نمودار ہوئے،ان ادوار میں بہت سی ایسی تحریکوں نے برصغیر پاکستان وہند کا رخ کیا جنکے مذہبی اعتقادات نے انتشار پھیلانے کی پوری پوری کوشش کی۔لیکن اس کے بالمقابل اسی عہد میں سیاسی تبدیلی کے ساتھ ساتھ نئ نئ علمی ومذہبی تحریکیں بھی شروع ہوئیں۔جس کی وجہ سے اسلام اور مسلم قوم کی پاسبانی ہوئی۔اس میں ایک زبردست تحریک حضرت مجدد الف ثانی کی تھی جو' مجددی' تحریک کے نام سے شہرت کی حامل ہے۔آپ نے اکبر کے غیر شرعی اعمال کا سختی اور جوانمردی سے مقابلہ کیا اور اسکے دربار کے بعض علماء کو اپنی جانب مبذول کرلیا۔آپکی تجدیدی دعوت وتبلیغ کی شہرت کے آگے دوسرے تمام علماء کے کارنامے ماند پڑ گئے۔شیخ مجدد کی تجدیدی دعوت ہر شعبۂ زندگی کی طرف پھیلی اور اسکی اشاعت وتبلیغ کے لئے آپ نے ملک کے گوشے گوشے میں اپنے خلفاء بھیجے۔علاوہ ازیں ان امراوزرا کو جنکی رسائی شاہی دربار تک تھی ان کو اپنے مکتوبات کے زریعے وقت کے اہم تقاضے کی طرف متوجہ کیا۔اکبر کی دینی بدعات کی وجہ سے اسلام پر جو ضرب کاری لگی ہوئی تھی اسکے لئے آپنے حکمراں طبقے کی بھی اصلاح کی کوشش کی۔بادشاہ کی اصلاح کے سلسلے میں آپنے اسکے سب سے زیادہ ممتاز رکن مرتضی خان فرید بخاری کو وسیلہ بنایا۔آپ کے نزدیک بادشاہ کی نسبت دنیا کے ساتھ ایسی ہے جس طرح دل کی نسبت بدن کے ساتھ ہے۔اگر دل صالح ہوگا تو بدن بھی صالح ہوگا۔اسی طرح دنیا کی بہتری بادشاہ کی بہتری پر منحصر ہے۔اسکے بگڑنے سے دنیا کا بگڑنا بھی لازمی ہے۔بادشاہوں کو پند ونصیحت کے سلسلے میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کا یہ بے باکانہ رویہ دیکھ کر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ساتویں صدی ہجری میں شیخ سعدیؒ نے پند ونصیحت کا جو بیج بویا تھا وہ دسویں صدی ہجری میں مجدد الف ثانیؒ کی ذات اقدس میں نظر آتا ہے۔شیخ سعدیؒ نے کسی بادشاہ کے غلط طریقے پر حامی نہیں بھری اور براہ راست امراوسلاطین کو حکیمانہ وموثر طریقے سے نصیحت کرتے رہے۔مثلاً''بوستان''میں سعدیؔ،بادشاہ وقت کو یوں نصیحت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں:

رعیت چون بیخند وسلطان درخت   درخت ای پسر باشد از بیخ سخت
مکن تا توانی دل خلق ریش   وگر می کنی،می کنی بیخ خویش[ے]

شیخ مجدد نے اپنی اصلاحی تحریک میں مسلم معاشرہ کے تینوں اہم طبقات علما،صوفیا اور اہل حکومت کو اپنا مخاطب بنایا اور ان سب سے خط وکتابت کے ذریعے رابطہ قائم کیا۔اور انھیں ان کا منصب ومقام یاد دلاتے ہوئے اس بات کی تلقین کی کہ وہ اسلامی تعلیمات اور قوانین شریعت کی پابندی پر پوری طرح گامزن ہو جائیں اور اپنے حلقہ اثر میں اسکی اشاعت کرنے کی کوشش کریں۔علاوہ ازیں ان کی اصلاح پر اس لئے بھی زیادہ اہمیت دی کیونکہ اس زمانے میں عقائد میں جو بھی فتنہ وفساد اور مذہبی وسماجی زندگی میں خرابیاں ہوئیں اس کے ذمہ دار بہت حد تک یہی لوگ تھے۔شیخ مجدد الف ثانی کی اصلاحی تحریک کو آگے بڑھانے میں سب سے اہم رول آپکی شاہکار تصنیف' مکتوبات امام ربانی' نے انجام دیا۔جس کو بادشاہ،امرا،علما اور صوفیا سے رابطہ قائم کرنے کا ذریعہ بنایا۔اور ان لوگوں کو زندگی کے ہر شعبہ میں قرآن سنت کے مطالبات اور احکام شریعت سے روشناس کیا۔مختصر یہ کہ خان اعظم،صدر

جہاں ،شیخ فرید اور دیگر علماء فضلا کے نام شیخ مجدد نے بیشتر مکاتیب لکھے ہیں جن میں آپ نے یہ نصیحت کی ہے کہ وہ بادشاہ کے تقرب سے فائدہ اٹھائیں اور کلمۂ حق کی ترغیب کرتے رہیں۔اوراحکام شریعت کی طرف بادشاہ کو راغب کریں۔عہد گذشتہ میں دین اسلام کو جوشدید نقصانات پہنچے۔آپ نے نہایت پردرد الفاظ میں اسکی عکاسی کی اوراپنے مکاتیب کے ذریعے ان تمام بدعات کو ختم کر کے امراء کا ذہن دینی تعلیمات کی طرف موڑ دیا۔

شیخ احمد نے علم شریعت کے حصول اوراجتائی طور پر اسے فروغ دینے کی اہمیت اور اسکے طورطریق کو واضح کرنے پر زور دیا ہے۔ساتھ ہی اس بات کی بار بار تلقین کی ہے کہ روزمرہ زندگی میں شریعت کے قوانین کی پابندی ہو۔درحقیقت یہی وہ بنیادی نقطہ ہے جس پر امام ربانی نے سب سے زیادہ زور دیا ہے اور یہی وہ پیغام ہے جو علما،صوفیا،اور حکمراں طبقہ کے نام خطوط میں بطور مشترک عنصر پایا جاتا ہے۔شیخ احمد نے ترویج شریعت کی راہ سے اہل حکومت کی اصلاح کے لئے جومشن شروع کیا تھا اس میں علم شریعت کو خاص اہمیت دی۔آپ علما کو ہر حال میں شریعت کی پابندی کی تلقین کرتے رہے ۔آپ کے نزدیک شریعت کے تین جزو ہیں(۱)علم (۲)عمل اور(۳)اخلاص۔آپ علما کوان تینوں اجزاء کا نمونہ دیکھنا چاہتے تھے۔ان ہی تینوں چیزوں سے شریعت اورحق تعالی کی رضامندی حاصل ہوتی ہے۔بہرحال علما ہو یا صوفیا،اہل حکومت ہو یا عوام ان سب کوآپ نے اتباع شریعت کی تلقین کی ہے اورانکے قلب میں یہ حقیقت جاگزیں کی کہ ہم سب کی نجات کا دارومدار انہیں چیزوں پر ہے۔اس کے علاوہ آپکی ایک اہم خدمت سلسلہ تصوف کی ترویج ہے۔آپ نے تصوف کے میدان میں سلسلہ نقشبندیہ کو اہمیت دی۔کیونکہ ان کے یہاں شریعت کی اتباع پر بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے اورآپکے مرشد خواجہ باقی باللہ بھی نقشبندیہ سلسلہ سے تعلق رکھتے تھے اس لئے آپ نے بھی اسی راہ طریقت کو ترجیح دی اوراس سلسلہ کے اصول تعلیمات کی اشاعت کے لئے آپ نے ہندو بیرون ہند کے تمام مشہور شہر میں اپنے خلفا بھیجے اور رشد وہدایت کا سلسلہ جاری کیا۔

شیخ مجدد کے عظیم کارناموں میں ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ انکے متعدد خطوط میں طریقہ نقشبندیہ کی تعلیمات کی ترجمانی ملتی ہے اور سنت نبوی کی اتباع ،شریعت کی پابندی واہمیت پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔سماع،رقص،ذکر جہری کی ممانعت اور غیر فطری ریاضت کی ناپسندیدگی ظاہر کی گئی ہے۔آپ نے یہ نقطہ بار بار واضح کیا ہے کہ تصوف کا مقصد نہ تو خدا کے ساتھ اتحاد ہے اور نہ اسکی صفات میں اشتراک ہے بلکہ اس کا مقصد اللہ کی خالص بندگی اور اسکی اطاعت ہے۔مقام عبدیت سے بڑھ کر کوئی دوسرا مقام نہیں۔تصوف کی نسبت سے آپ کا ایک اورعظیم الشان کارنامہ یہ بھی ہے کہ اس کا ناقدانہ جائزہ لے کر اسلامی وغیر اسلامی طریقے کی وضاحت کی اورصوفیوں کے افکار واعمال سے متعلق معتدل رویہ اختیار کرتے ہوئے یہ بات ثابت کرنے کی سعی کی ہے کہ ان کے کون سے افکار وافعال شریعت کے مطابق ہیں اور کون خلاف شرع۔اس کے علاوہ آپ نے عقیدہ وحدۃ الوجود کے برعکس ایک نظریۂ وحدۃ الشہو دٗ پیش کیا اور تمام مسلمان،صوفیا،علما کے جوبھی اختلافات تھے ان کو دفع کیا۔آپ کے قول کے مطابق وحدۃ الوجود کا مقام سالک کوراہ سلوک کی ابتدا میں پیش آتا ہے جس سے گزر کر اسے آگے جانا ہوتا ہے اور جوشخص اس سے بالاتر مقام پر پہنچ جاتا ہے وہ وحدۃ الشہود کا مقام پالیتا ہے جو عین شرع کے مطابق ہے[۸]۔شیخ مجدد سے پہلے بھی ہندوستان میں وحدۃ الشہود کا نظریہ پایا جاتا تھا۔لیکن آپ نے اسے زیادہ منظّم ومدلل طور سے پیش کیا۔اوراسے دلائل اور براہین کی روشنی سے مستحکم کیا۔

شیخ مجدد نے سنت اورشریعت کی اشاعت کو ہی اپنی زندگی کا مقصد بنایا اوراسکی تبلیغ واشاعت پر زور دیا ہے۔آپ کے مطابق یہی وہ راستہ ہے جس پر چل کر مسلمانوں کی زندگی میں سدھار لایا جاسکتا ہے۔پھر چاہے وہ کسی بھی طبقے سے تعلق کیوں نہ رکھتے ہوں۔آپ کی یہ بلند فکر آپ کے مکتوبات میں جابجا نظر آتی ہے۔درحقیقت آپ نے اپنی پوری زندگی قرآن وحدیث کی روشنی میں صرف کردی۔اوٗرمجدد الف ثانی' کے لقب سے مشرف ہوئے۔آپ کو یہ لقب عہد اکبری وجہانگیری میں اپنے انقلابی وتجدیدی کارناموں کی وجہ سے حاصل ہوا۔اور کتابوں اورتذکروں کی روایت کے مطابق سب سے پہلے مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی نے آپ کواس لقب سے نوازا[۹]۔شیخ مجدد کی عظیم اوراعلی مرتبت شخصیت کو دیکھتے ہوئے یہ حدیث آپ کے اوپر صادق آتی ہے۔

''امت اسلامہ کے پختہ کار ربانی علماء ہر زمانہ میں موجود رہے گیں جوراہ مستقیم پر جم کر متوسلین کو بھی سیدھی راہ بتاتے رہیں گے[۱۰]۔

اسی طرح ایک اور حدیث میں فرمایا گیا۔

خداوند عالم اس امت کے لئے ہر ۱۰۰ سو سال پر ایک ایسا شخص پیدا کرتا رہے گا جو دین کو تازہ کرتا رہے گا[۱۱]۔

(ابوداؤد شریف، مستدرک حاکم، معجم اوسط، طبرانی، بیہقی وغیرہ)

مندرجہ بالا احادیث کی روشنی میں یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ انہیں خدا رسیدہ ہستیوں میں ایک فرد شیخ احمد سرہندی بھی ہیں۔ جو اسلام کی تاریخ میں تقریباً ساڑھے چودہ سو سال بعد مجدد بنا کر بھیجے گئے۔ آپ کے تجدیدی اور حکیمانہ کارنامے اتنے عظیم الشان ہیں کہ ہر دور کے جلیل القدر علماء و محققین چاہے ان کا تعلق زمانہ جدید سے ہو یا قدیم سے یا پھر معاصرین میں سے، سب نے آپ کے افکار و خیالات اور کار تجدید کا مطالعہ کیا ہے اور آپ کی علمی صلاحیت کا اعتراف کرتے ہوئے خراج عقیدت پیش کی ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد آپکے کارنامے پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں کہ۔

''شہنشاہ اکبر کے عہد کے اختتام اور عہد جہانگیری کے اوائل میں کیا ہندوستان علماء و مشائخ حق سے بلکل خالی ہو گیا تھا؟ کیسے کیسے اکابر موجود تھے لیکن مفاسد وقت کی اصلاح و تجدید کا معاملہ کسی سے بھی بن نہ آیا۔ فقط مجدد الف ثانی شیخ سرہندی کا وجود گرامی ہی تن تنہا اس کاروبار کا کفیل ہوا[۱۲]۔''

مولانا سید ابوالاعلی مودودیؒ اس سے بھی زیادہ پرزور الفاظ میں آپ کے طریقۂ رشد و ہدایت کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''ہندوستان کے مختلف گوشوں میں اس وقت بھی بہت سے حق پرست علماء اور سچے صوفیہ موجود تھے مگر ان کے درمیان وہ ایک اکیلا شخص تھا جو وقت کے ان فتنوں کی اصلاح اور شریعت محمدی کی حمایت کے لئے آگے آیا۔ اور جس نے شاہی قوت کے مقابلہ میں یکہ و تنہا احیاء دین کی جد و جہد کی[۱۳]۔''

انکے علاوہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، علامہ اقبال، مولانا محمد منظور نعمانی، مولانا محمد عبدالشکور فاروقی، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور ڈاکٹر عبد الحق انصاری وغیرہ آپکے طریقۂ کار کے معترف رہے ہیں[۱۴]۔

مختصر یہ کہ حضرت مجدد الف ثانی صاحب فکر، صاحب بصیرت اور صاحب عزیمت عالم تھے۔ جن پر مسلمانوں کو ہمیشہ فخر رہے گا۔ آپ نے اپنی تمام زندگی احیاء دین اور شریعت کی اشاعت میں وقف کر دی، اور ہندوستان کے مسلمانوں کی بقاء، انکے ایمان کی حفاظت اور انکی فلاح و بہبود کے لئے گھلتے رہے، اور آپ تا عمر بس اسی فکر میں کوشاں رہے کہ دین اسلام کو عہد اکبری میں جو نقصان پہنچا ہے اس کا کسی طرح ازالہ ہو سکے۔ یہ وہ دور تھا جب اکبری فتنہ نے پورے ملک میں بدگمانی پھیلا رکھی تھی جس میں ابوالفضل اور فیضی جیسے بڑے بڑے دانشور ظاہری طور پر نہ سہی باطنی طور پر شریک تھے۔ ایسے پرفتن دور میں شیخ احمد سرہندی وہ عظیم شخصیت تھی جنھوں نے اسلام کے بجھتے ہوئے چراغ کو اپنے کار تجدید سے دوبارہ منور کیا۔ اس کوشش میں آپ کو قید و بند کی صعوبتیں بھی اٹھانی پڑی۔ مگر اس کے باوجود آپکے پائے ثبات کو لغزش نہیں آئی۔ اور قید خانے میں بھی آپ کی ذات سے فیض جاری رہا اور ہزاروں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ غیر مسلمانوں کو بھی دین اسلام سے مشرف کیا۔ آپکی بے لوث کوشش اور جد و جہد سے اسلام کو حیات نو ملی۔ دربار میں جہاں بادشاہ کے خلاف کسی کو آواز اٹھانے کی جرأت نہیں ہوتی وہاں آپ نے جہانگیر کے حکم کی مخالفت کرتے ہوئے رسم دربار کے مطابق سجدۂ تعظیمی (آداب شاہانہ) سے سختی سے انکار کر دیا۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ دور مغلیہ میں سجدۂ تعظیمی کی روایت جو زمانے سے چلی آ رہی تھی جہانگیر نے اسکو ہمیشہ کے لئے اپنے دربار سے منسوخ کر دیا اور پھر یہ روایت صرف یہیں تک محدود نہیں رہی بلکہ بعد کے آنے والے ادوار یعنی شاہجہاں اور اورنگزیب تک قایم رہی۔ آپ کو اس بات کا بخوبی علم ہو گیا تھا کہ ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جہاں بادشاہیت کے علاوہ کوئی طرز روش اپنانا غیر ممکن ہے۔ اس لئے آپنے بجائے انقلابی قدم اٹھانے کے اصلاحی، تجدیدی اور حکمتی طریقۂ کار اختیار کیا اور وزرا و امراء کے ذریعے بادشاہ وقت کو صراط مستقیم پر چلنے کی تلقین کرتے رہے اور جہانگیر کے ساتھ رہ کر ''عالم آخرت'' کا فریضہ انجام دیتے رہے، اور دنیا والوں کے سامنے یہ ثابت کر دیا کہ ہندوستان کی ملت اسلامیہ کے سرمایہ کے آپ ہی

نگہبان تھے۔ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ مسلمان ذہنی اور فکری زوال کے بھنور سے نکلنے میں کامیاب ہوئے۔اور آپ کی ذات بابرکت سے اسلامی دنیا میں جو انقلاب رونما ہوا اسکا مبارک فیض آج تک جاری وساری ہے اور یہ کہنا مبالغہ آرای سے خالی ہوگا کہ ہندوستان میں اسلام کی بقا کا ایک بڑا سبب حضرت امام ربانی کا وجود گرامی ہے۔الغرض آپ نے اپنے تبلیغی واصلاحی مشن کو کامیابی کے ساتھ پورا کرنے کے بعد ۲۸ صفر ۱۰۳۴ھ مطابق یکم دسمبر ۱۶۲۴ء بروز منگل کو ترسٹھ سال کی عمر میں سرہند میں داعی اجل کو لبیک کہا[۱۵]۔

مفکر اسلام و مدبر قوم وملت علامہ اقبال آپ کی ذات سے بیحد متأثر نظر آتے ہیں۔انہوں نے اپنے اشعار میں آپ کی ذات وصفات کی تصویر کشی کرتے ہوئے اپنے جذبات کا اظہار یوں کیا ہے:

حاضر ہوا میں شیخ مجدد کی لحد پر وہ خاک کہ ہے زیر فلک مطلع انوار
اس خاک کے ذروں سے ہیں شرمندہ ستارے اس خاک میں پوشیدہ ہے وہ صاحب اسرار
گردن نہ جھکی جسکی جہانگیر کے آگے جس کے نفس گرم سے ہے گرمی احرار
وہ ہند مین سرمایۂ ملت کا نگہبان اللہ نے بر وقت کیا جس کو خبردار

حواشی:

۱۔سرہند میں فارسی ادب،ڈاکرادریس احمد،اچابک سواران،لال کنواں دہلی ۶،ستمبر ۱۹۸۸ء،ص ۲۱۰

۲۔ ایضاً ص،۲۱۰

۳۔علمائے ہند کا شاندار ماضی،حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندی،مکتبہ رشیدیہ،کراچی،۱۹۹۱ء،ص ۳

۴۔روضۃ القومیۃ،بحوالہ بزم تیموریہ،جلد دوم،سید صباح الدین عبدالرحمٰن،دارالمصنفین شبلی اکیڈمی،اعظم گڑھ،۲۰۰۹ء،ص ۱۱۱

۵۔زبدۃ المقات،منشی نول کشور،ص ۱۴۴

۶۔ ایضاً ص ۱۴۵

۷۔بوستان سعدی،وقار علی بن مختار علی،تھانوی دیوبند،ص ۱۳

۸۔سرہند میں فارسی ادب۔ص ۲۴۷۔

۹۔فکراسلامی کے فروغ میں شیخ احمد سرہندی کے خدمات (سیمنار مقالات) مقالہ ظفر اسلام،ادارہ علوم اسلامیہ،علیگڑھ مسلم یونیورسٹی۔علیگڑھ۔۲۰۰۵،ص ۲۸۔

۱۰۔علمائے ہند کا شاندار ماضی،ص ۲۰

۱۱۔ ایضاً ایضاً

۱۲۔تذکرہ،مولانا ابوالکلام آزاد،مرتبہ فضل الدین احمد مرزا،انارکلی کتابیات،لاہور۔ص ۲۶۴۔

۱۳۔تجدید واحیاءدین،سید ابوالاعلی مودودی بہ حوالہ فکر اسلام کے فروغ میں شیخ احمد سرہندی کی خدمات،(سیمنار مقالات) مقالہ اشہد رفیق ندوی،ص ۶۱۔

۱۴۔ ایضاً ایضاً ص ۱۵۔

۱۵۔اسرار کشف صوفیہ،سید محمد کمال سنبھلی واسطی،رضا لائبریری،رام پور،اتر پردیش،۲۰۱۳،ص ۸۷

☆☆☆

علامہ اقبال کی شاعری پند وموعظت کی آئینہ دار

عاطفہ جمال، مکان نمبر ۱۶۷، اوپری اشراف ٹولہ (جنوبی)، سندیلہ، ہردوئی، یوپی

مرزا اسداللہ خاں غالبؔ کے بعد ہندوستان میں فارسی شاعری پر جوسکوت کے بادل مثل کالی رات سایہ فگن ہوئے اس سے ارباب علم واہل نظر نے یہ تو سمجھا کہ یہ سکوت کسی طوفان کا پیش خیمہ ہے لیکن انہیں شاید اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ یہ وقفہ ایک رستخیز کی تیاری ہے جو ہندوایران کو ہی نہیں بلکہ پورے عالم میں ایک انقلاب برپا کردے گا، شاعری کی دنیا کو ایک نئی زمین میسر ہوگی، عشقیہ غزلوں کی جگہ فلسفیانہ مضامین اور صوفیانہ مثنویاں لے لیں گی اور شاعری معاشرہ اور ملت کی اصلاح کے لئے ہونے لگے گی۔ فارسی شعروادب کے بحر بے کراں میں اس انقلاب کے محرک کے نام سے تو سارا عالم ہی واقف ہے جسے لوگ ادب واحترام سے سرمحمد اقبال کہتے ہیں۔ علامہ اقبال کی عام فہم اردو شاعری سے تو نوخیز بچہ بھی اسی وقت آشنا ہو جاتا ہے جب اسے یہ ترانہ یاد کرایا جاتا ہے:

سارے جہاں سے اچھا، ہندوستاں ہمارا ہم بلبلے ہیں اسکی یہ گلستاں ہمارا

یا جب یہ دعا پڑھتا ہے:

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

مگر علامہ اقبال کی بیشتر شاعری کے طلسم کو سمجھنے کے لئے دماغ ودل کو معمر بنانا پڑتا ہے کیونکہ پند وموعظت، نوید زندگی، فلسفہ، صوفیانہ مضامین کو ایسے موثر انداز میں شعریت کا جامہ پہناتے ہیں جیسے چرخ کہن میں ماہ ومہر۔ ڈاکٹر محمد اقبال نے اردو کی تقریباً تمام صنف مثلاً غزل، قطعہ، رباعی، مثنوی اور قصیدہ میں طبع آزمائی کی اور ہر ہر صنف کو اسکے بام عروج تک پہنچا دیا انکے کلام میں شاعرانہ لطافت، شاعرانہ زور اور شاعرانہ رنگینی کا بہترین امتزاج جلوہ گر ہے۔ مگر اقبال کی اردو شاعری کی جو سب سے مقدم چیز ہے وہ ہے مثنوی، مگر علامہ اقبال کی اردو شاعری پر روشنی ڈالنے سے قبل انکے حالات زندگی جو کہ عموماً زبان زدِ خاص وعام ہیں تبرکاً قلم زد کرنا بیجا نہیں سمجھتی ہوں۔

علامہ اقبال ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے، انکے آباء واجداد کشمیری براہمن تھے، اقبال کے والد شیخ نور محمد اگر چہ زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے مگر علم دینوی ودنیوی میں ایسی دست رس رکھتے تھے، کہ لوگ انہیں ان پڑھ فلسفی کہتے تھے اپنے والد بزرگوار کی صحبت میں انہوں نے اسلامیات، عرفان وتقویٰ وفلسفہ کی تعلیم پائی، اوراس تربیت نے انکے ذہن خداد کو علوم دینوی وعلوم اسلامی سے منور کر دیا، اقبال کے دو بڑے بھائی وچار بڑی بہنیں تھیں ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کرنے کے بعد سکاچ مشن اسکول میں داخلہ ہوا، اپنی خداداد صلاحیتوں اور منور ذہن کی وجہ سے انہوں پرائمری، مڈل ومیٹرک میں وظیفہ حاصل کیا، ایف اے کا امتحان سکاچ مشن کالج سیالکوٹ سے پاس کرنے کے بعد گورمنٹ کالج لاہور میں داخل ہو گئے، بی اے میں عربی میں سارے پنجاب میں اول رہے، ۱۸۹۹ء میں ایم اے (فلسفہ) کا امتحان پاس کیا اور گولڈ میڈل بھی حاصل کیا، اسکے بعد انہوں نے چھوٹے چھوٹے اداروں میں تدریسی فرائض بھی انجام دئے اور علمی وادبی کارنامے بھی انجام دئے ۱۹۰۳ء میں گورمنٹ کالج میں فلسفہ کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے اور شعروشاعری کا آغاز کیا تبھی سے انکی نظمیں انجمن کے سالانہ جلسوں کی امتیازی خصوصیت بن گئیں، ۱۹۰۵ء میں انہوں نے تحصیل علم کے لئے بیروں ملکوں کا سفر اختیار کیا وہ انگلستان وجرمنی گئے، وہیں انہوں نے اپنی پی ایچ ڈی بھی مکمل کی اور چھ ماہ کے لئے لندن یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر بھی رہے، انہوں بیرسٹری کا امتحان بھی پاس کیا، واپس آنے پر گورمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کے پروفیسر مقرر ہوئے، حکومت نے انہیں درس وتدریس کے ساتھ ساتھ وکالت کی بھی اجازت دے رکھی تھی مگر کچھ دنوں بعد وانہوں نے وپروفیسری کو خیرآباد کہہ دیا اور وکالت سے دانستہ طور پر نبردآزمہ ہوئے، ہمہ گیر صلاحیتوں کے باوجود انہیں وہ مقام ابھی تک نہ ملا تھا جسکے وہ مستحق تھے مگر ۱۹۱۰ء میں شائع ہوئی انکی تخلیق مثنوی اسرار خودی نے وہ شور بپا کیا کہ اقبال

کا نام زبان زد وخاص وعام ہوگیا اور اسکے بعد پے در پے انکی نظموں کا سلسلہ شروع ہوگیا اور اقبال کے نام کا تیزی سے آسمان کی حدود کو چھونے کے لئے بڑھتا چلا گیا، اقبال نے سیاست میں بہت کم حصہ لیا انکا نصب العین اسلامی مقاصد کے تحفظ اور مسلمانوں کی بہبود کے لئے وقف تھا، ۱۹۲۶ء کے انتخابات میں وہ پنجاب کی مجلس قانون ساز کے رکن بنے، ۱۹۳۰ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس الہ آباد کے صدر چنے گئے گول میز کانفرنس کے آخری دو اجلاس میں بھی شریک رہے، مسلم کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے اسلامی نصب العین کے تحفظ اور مسلمانوں کے قومی حقوق کے حصول کے لئے انہوں نے انتہائی استقامت سے کام لیا، اقبال کی اصلی شہرت کی کلید شاعری ہے مگر اسکے ذریعے بھی انہوں نے قوم کو بیدار کرنے سماج میں اصلاح پیدا کرنے اور نظام کو بہتر بنانے کی کوشش کی، دسمبر ۱۹۳۳ء میں پنجاب یونیورسٹی نے اور اس سے اگلے سال علی گڑھ یونیورسٹی نے اقبال کو ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی، اور ۱۲اپریل ۱۹۳۸ء کو یہ شہرہ آفاق شاعر، واحد زماں فلاسفر اور راہ حق شیدائی اس دار فانی سے کوچ کر گیا۔

علامہ اقبال اردو کے منفرد شاعر تھے، نہ انکی شاعری محبوب کی گھنی زلفوں کے سائے جیسی تھی نہ محبوب کی خوبصورت آنکھوں کے لئے، انکے قلب میں جو سوز تھا وہ اسلام اور ملت کے لئے تھا انہوں نے اپنی شاعری قوم کو راہ راست پر لانے کے لئے کی ورنہ جس شاعر نے نظموں کو اور مثنویوں کو ایسے بہترین پیرایۂ میں ادا کیا کہ عوام کے دل پر حکومت کرنے لگا کیا اسکے دماغ میں محبوب کا خاکہ نہ تھا کیا اسکے دل میں تغزل نہ تھا، اگر وہ بھی چاہتا تو غالب اور میر کی طرح غزل کا بے تاج بادشاہ بن سکتا تھا، اقبال کی شاعرانہ لیاقت کا مظاہرہ کرنے کے لئے صفحوں کی نہیں دفتروں کی ضرورت ہوگی ہم یہاں انکی شاعری کو جھلک کے طور پیش کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔ علامہ سرڈاکٹر محمد اقبال کی اردو شاعری کی ایک جھلک نظر گزار کریں۔

غزل:۔ علامہ اقبال کی اردو غزلیں تغزل کا بہترین نمونہ ہیں، یہاں الفاظ مثل گہر پروئے گئے ہیں جنکے آب وتاب سے مضامین میں ایک عجب سوز وگداز پیدا ہوگیا ہے، ہر ہر شعر کی تشریح کے لئے ایک مستقل باب منظر عام پر آجاتا ہے۔ جو کہ ہم جیسے ناچیز طلب علموں کے لئے بھی مشعل راہ ثابت ہوتا ہے، کیونکہ انکی غزلوں میں بھی اشارہ وکنایہ کے ذریعہ قوم کو راہ راست پر لانے کے تمام تر حربہ موجود ہیں، مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

☆ ملے گا منزل مقصود کا اسی کو سراغ — اندھیری شب میں ہے چیتے کی آنکھ جس کا چراغ

☆ زندگی انساں کی اک دم کے سوا کچھ بھی نہیں — دم ہوا کی موج ہے، رم کے سوا کچھ بھی نہیں

☆ چمک تیری عیاں بجلی میں آتش میں شرارے میں — جھلک تیری ہویدا چاند میں سورج میں تارے میں

قطعات و رباعیات:۔ خیالات اور جذبات کی عکاسی کرنے میں کوئی بھی شاعر علامہ اقبال کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کرسکتا، چونکہ قطعات ورباعیات کا کوئی اٹل موضوع نہیں ہوتا یا یوں کہیں کہ یہ اصناف اپنے اندر مختلف مضامین کا ذخیرہ چھپائے رہتی ہیں اسلئے انکے لئے اس صنف کی سب سے زیادہ ضرورت تھی، اور اسی ضرورت کے لئے انہوں نے دو دو شعر کے بکثرت قطعات لکھے۔ چند قطعات حسبذیل ہیں:۔

☆ کل ایک شوریدہ خواب گاہ نبیؐ پہ رو رو کے کہہ رہا تھا — کہ مصر و ہندوستان کے مسلم بنائے ملت مٹا رہے ہیں
یہ زائران حریم مغرب ہزار رہبر بنیں ہمارے — ہمیں بھلا ان سے واسطہ کیا جو تجھ سے نا آشنا رہے ہیں

☆ مشرق میں اصول دین بن جاتے ہیں — مغرب میں مگر مشین بن جاتے ہیں
رہتا نہیں ایک بھی ہمارے پلّے — واں ایک کے تین تین بن جاتے ہیں

نظمیں:۔ علامہ اقبال کی اردو نظموں میں قومیت اور وطنیت کے بجائے فلسفہ، شعر اور سیاست جیسے مضامین جلوہ گر ہیں، علامہ اقبال کی نظموں میں سیاست وفلسفہ کے علاوہ ایرانی شعرا کے بہاریہ قصیدہ کی طرز پر چند بے مثال نظمیں قابل دید ہیں جنمیں کشمیر کے دل فریب مناظر، خوش گوار آب وہوا، اور باغ نشاط کا حسین منظر نظروں کے رقص کرتا نظر آتا ہے:۔

☆ کیوں خالق ومخلوق میں حائل رہیں پردے — پیران کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو

حق رابسجو دے،صنماں را بطوا فے　　　　　بہتر ہے چراغ حرم ودیر بجھادو
میں ناخوش وبیزار ہوں مرمر کی سلوں سے　　　　　میرے لئےمٹی کا حرم اور بنادو

مثنویاں:۔ علامہ اقبال کی پہلی مثنویوں میں شاعرانہ اور والہانہ رنگ نظر آتا ہے وہ انکی بعد کی مثنویوں گلشن راز جدید، جاوید نامہ، مسافر اور پس چہ باید کرد میں نظرنہیں آتا انمیں انکا رنگ شاعرانہ رنگ پر واعظانہ رنگ حاوی ہوتا نظر آتا ہے لیکن انمیں جس اخلاق کا درس انہوں نے دیا ہے وہ شاید کہیں اور نہ نظر آئے جسکے متعلق پروفیسر عبدالقادر سروری صاحب اپنے مضمون ''اقبال کی شاعری کا آخری دور'' بحوالہ سب رس اقبال نمبر ص ۱۹ پر یوں لب کشاں ہیں کہ:۔

''غرض موجودہ زندگی کے بہت کم مسائل ہوں گے جن پر اقبال نے اس زمانے میں روشنی ڈالی ہو یا تنقید نہ کی ہو، اگر کوئی قوم جو حالت پستی میں ہو اقبال کے صرف آخری زمانے کے کلام کو اپنی زندگی کا نصب العین بنائے تو یقین ہے کہ اس میں حیات کی ایک تازہ لہر پیدا ہو جائے گی''۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

محکم کیسے ہو زندگانی　　　　کس طرح خودی ہو لازمانی
آدم کو ثبات کی طلب ہے　　　　دستور حیات کی طلب ہے
دنیا کی عشا ہو جس سے اشراق　　　　مومن کی اذاں ندائے آفاق

علامہ اقبال کی شاعری کا صرف ایک ہی مقصد ہے ہمہ گیر انقلاب، اس زمانے میں انقلاب کے مدعی تو بہت ہیں لیکن انکا انقلاب محدود ہے، کوئی سیاست میں انقلاب لانا چاہتا ہے، کوئی تعلیم میں کوئی مذہب میں اور کوئی تصوف میں انقلاب کا خواستگار ہے مگر اقبال ایسی واحد ہستی ہیں جنہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے ہر میدان میں انقلاب برپا کر دیا، علامہ اقبال نے اگر اپنی اپنے پورے شعری ورثہ میں صرف مندرجہ ذیل چند شعر ہی چھوڑے ہوتے تو انکا متبادل بڑے بڑے شاعروں کے دیوانوں کی شکل میں بھی نہ ملتا مگر انکے دواوین فارسی واردو ایسا چرخ ہیں جسکا نہ اول ہے نہ آخر نہ حد ہے نہ دیوار، شعر ملاحظہ ہوں:

☆ قوم مذہب سے ہے، مذہب جو نہیں تم بھی نہیں　　　　جذبِ باہم جو نہیں، محفل انجم بھی نہیں
☆ کٹی ہے رات تو ہنگامہ گستری میں تیری　　　　سحر قریب ہے اللہ کا نام لے ساقی
☆ دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے　　　　پر نہیں طاقت پرواز مگر رکھتی ہے
قدسی الاصل ہے رفعت پہ نظر رکھتی ہے　　　　خاک سے اٹھتی ہے گردوں پہ گزر رکھتی ہے
☆ ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز　　　　نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز
☆ اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبان عقل　　　　لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑئے
☆ جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا　　　　تو کر لیتا ہے یہ بال وپرِ روح الامیں پیدا

☆☆☆

حضرت نظام الدین اولیاء اور امیر خسروؔ

ظہیرعباس، ریسرچ اسکالر، شعبہ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

حضرت نظام الدین اولیاء کا پورا نام محمد بن احمد علی البخاری نظام الدین اولیاء تھا۔ ہندوستان میں آپ کو سلطان المشائخ کے نام سے بالعموم یاد کیا جاتا ہے، آپ کے دادا بخارا کے رہنے والے تھے آپ کی ولادت بدایوں کی ہے۔آپ مشائخ چشت ہند کے سلسلے کے چوتھے خلیفہ تھے۔خواجہ معین الدین چشتی اجمیری، خواجہ بختیار کا کی، خواجہ فرید الدین مسعود گنج شکر اور اس کے بعد حضرت نظام الدین اولیا ہیں۔آپ نے بڑی طویل عمر پائی۔خاندان غلامان و خاندان خلجی اور خاندان تغلق دس گیارہ بادشاہوں کا زمانہ دیکھا۔ایسے بادشاہ بھی آئے جنہوں نے ان سے مجبوراً دلی چھوڑنے کے لئے کہا لیکن وہ خود ہی دہلی تو کیا اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے۔

آپ کے والد کا نام احمد بن دانیال تھا۔آپ غزنین سے ہندوستان آئے تھے والدہ کی تلقینات کی وجہ سے خواجہ نظام الدین اولیاء کا رجحان مذہب کی طرف ہو گیا۔احمد بن دانیال کا انتقال ہوا تو یہ لوگ دہلی آ گئے۔ماں نے بیٹے کی تعلیم میں غفلت نہیں کی۔تعلیم سے فارغ ہوتے ہی حضرت امور باطنیہ میں ماہر ہو گئے۔

آپ نے شہر دہلی کے قریب ہی غیاث پور میں قیام کر لیا۔آپ کی خانقاہ مرجع خاص و عام تھی۔سلطان المشائخ حضرت محبوب الٰہی کی درگاہ کا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا تھا۔امیر و غریب عارف و عامی ہر شخص کو ان کی خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت تھی۔جو شخص جس وقت ملنے کے لئے آتا بار یاب ہوتا۔تاریخ مشائخ چشت میں خلیق احمد نظامی نے ضیاء الدین برنی مصنف تاریخ فیروز شاہی کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''اسی زمانے میں شیخ الاسلام نظام الدین نے بیعت عام کا دروازہ کھول رکھا تھا۔وہ گنہگاروں کو خرقہ پہناتے تھے۔اور ان سے توبہ کرواتے تھے۔اور خود اپنے ارادے سے قبول کرتے تھے۔ہر شخص کو خواہ خاص ہو یا عام، مالدار ہو یا غریب، آزاد ہو یا غلام ہر ایک کو طاقیہ عطا فرماتے، مسواک دیتے اور توبہ کراتے تھے۔اور سب لوگ چونکہ اپنے آپ کو حضرت کا مرید اور خدمت گار سمجھتے تھے۔اس لئے غیر مانوس باتوں سے پرہیز کرتے تھے۔شہر سے غیاث پور تک مختلف مقامات پر چبوترے بنائے گئے تھے چھپر ڈال دئے تھے۔ہر چبوترے اور ہر چھپر میں ایک حافظ اور ایک خادم مقرر کر دیا گیا تھا۔تا کہ مریدوں، توبہ کرنے والوں اور نیک لوگوں کو شیخ کے آستانے تک آنے جانے میں نماز کے ادا کرنے میں کوئی تردد نہ ہو۔بلبن نے شیخ سے امامت قبول کرنے کو کہا تھا تو کتنا برجستہ جواب دیا۔ہمارے پاس سوائے نماز کے اور کیا ہے، کیا بادشاہ یہ چاہتا ہے کہ وہ بھی جاتی رہے۔

چشتیہ سلسلے کے مشائخ ہمیشہ بادشاہوں اور شاہی ریشہ دوانیوں سے دور رہے۔کیقباد، قطب الدین خلجی، مبارک شاہ اور غیاث الدین تغلق خواجہ نظام الدین کے خلاف رہے۔محمد تغلق بھی ان کے دیوگیری میں منتقل ہونے سے انکار کرنے پر خوش نہیں تھا۔لیکن یہ ایک مرد آہن تھے۔قلندرانہ شان سے رہے۔اور کسی بادشاہ کی چیرہ دستی کی پرواہ نہیں کی۔بعض واقعات تو ایسے ہیں کہ لوگ حضرت کا معجزہ ہی قرار دیتے ہیں۔غیاث الدین تغلق جب بنگال کی مہم پر گیا تو کہہ گیا کہ میری واپسی تک دہلی چھوڑ دینی ہو گئی۔وہ دن نزدیک آ رہا تھا اور مریدین کہہ رہے تھے کہ حضرت اب کیا کیا جائے۔انہوں نے فرمایا، 'ہنوز دلی دور است'۔

ایسے ہی امیر خسروؔ جیسی مایہ ناز ہستی بھی دامن شیخ سے وابستہ تھی۔بلکہ دونوں کی محبت عشق کے درجے تک پہونچ گئی تھی۔حضرت امیر خسرو کو 'ترک اللہ'' کے نام سے یاد کیا کرتے تھے۔خسروؔ کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ۶۷۱ ھجری کو گویا اٹھارہ سال کی عمر میں شیخ کے مرید ہوئے تھے۔اور انہوں نے شیخ سے بیعت کر لی تھی۔شیخ طوطی ہند امیر خسروؔ کے کلام کی چاشنی سے ضرور پہلے لطف اندوز ہو چکے ہوں گئے۔چنانچہ جب وہ قصد بیعت کے لئے آئے تھے۔تو شیخ نے دربان سے کہا ایک ترک ہم سے ملنے کے لئے آیا ہے اسے لے آؤ تواضع اور مدارت سے پیش آئے۔جب خسروؔ

نے بیعت کی تو شیخ نے ایک بارانی اور ایک کلاہ چہارتر کی عنایت کی اس کے بعد دونوں ایک دوسرے سے بغایت مانوس ہو گئے۔شیخ نے ایک بار فرمایا تھا۔کہ قیامت کے دن میرا نامہ اعمال اس ترک کے سوز دل کی آتش سے صاف ہو جائے گا۔انہوں نے امیر خسرؔو کی مدح میں ایک رباعی بھی کہی ھے۔خواہ سچ ہو خواہ محض روایت،لیکن آخر کے دونوں مصرعے لاجواب ہیں۔

آن خسرؔو ماست ناصر خسرؔو نیست

زیرا کہ خدائے ناصر خسرؔو ماست

یہ بھی روایت ہے کے انہوں نے وصیت کی تھی کہ ہم دونوں کو پہلو بہ پہلو دفن کرنا۔چونکہ ایک قبر میں دو آدمیوں کا دفن کرنا شرعاً جائز نہیں اس لئے یہ شرط ہے ورنہ یہی کہتا کہ ایک ہی قبر میں دفن کرنا۔

خسرؔو کا کمال یہ تھا کہ جن شاہان وقت کو حضرت نظام الدین اولیاء سے بنتی نہیں تھی۔یہ ان کے ساتھ برابر منسلک رہتے ہوئے حضرت کے پاس اسی ارادت مندی سے آتے جاتے رہے۔کسی کے ماتھے پر بل نہیں آیا۔نظم میں کئی تصنیفات میں خسرؔو نے اپنی ارادت مندی کا اظہار کیا ہے،

خسرؔو کی معنوی زندگی کا سب سے اہم واقعہ نظام الدین اولیاء سے بیعت ہے۔خسرؔو کو اپنے مرشد سے بے پناہ عقیدت تھی۔ان کے اور نظام الدین اولیاء کے تعلقات کے بارے میں بہت سی باتیں مشہور ہیں جس سے یہ امر واضح ہو جاتا ھے کہ مرشد اور مرید میں غیر معمولی تعلقات تھے۔نظام الدین اولیاء کے کردار کی سب سے اہم خصوصیت یہ تھی۔کہ انہوں نے کبھی کسی بادشاہ کے آستانہ پر سر نہیں جھکایا،کبھی کسی دربار میں حاضری نہیں دی اور کبھی دنیاوی جاہ وحشمت سے عزت نفس کا سودا نہیں کیا۔دہلی کے سلاطین میں معزالدین کیقباد،قطب الدین مبارکشاہ اور غیاث الدین تغلق خاص طور پر شیخ سے ناراض تھے مگر شیخ نے ان کی رضامندی کے مقابلے میں دہلی کو ترک کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔نظام الدین اولیاء کی شان فقیری میں غیر معمولی بے نیازی تھی۔ان کے روحانی غنا اور باطنی ثروت سے ان کے مرید یقیناً متاثر ہوئے ہوں گے اور اپنی زندگی میں فقر وغنا کی شان پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوں گئے،

نظام الدین اولیاء نے خسرو کی شخصیت کو کس طرح سنوارا نکھارا اور ان کی ذات نے امیر کی شاعری کو جلا بخشی۔یہ ایک اہم سوال ہے۔میرے خیال میں خسرو کی غزلوں میں جو والہانہ اور سرمست انداز ہے۔وہ نظام الدین اولیاء کی صحبت کا فیضان ہے۔خسرو کی غزل کی جو خصوصیت سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے وہ وقوع گوئی،معاملہ بندی یا لفظی پینترے بازی نہیں بلکہ کیف وسرمستی کا وہ رچا ہوا انداز ہے۔جو روح کے گداز اور دل کے سوز سے پیدا ہوتا ہے۔جب شاعر کے دل کی گہرائیوں سے جذبات کے سوتے پھوٹتے ہیں۔جب عشق وغم کی آگ میں تپ کر اسکی شخصیت کندن بنتی ہے۔تب کہیں غزل میں ایسا والہانہ اور سرمست انداز پیدا ہوتا ہے۔خواجہ حسن نے ملفوظات شیخ پر مشتمل ایک کتاب فوایدالفوایدکے نام سے لکھی،آپ نے بھی اسی نوع کی ایک کتاب افضل الفوائد کے نام سے لکھی،ہر چند یہ مختصر ہے۔لیکن استناد میں مقدم ہے۔کیوں کہ شیخ سے انہیں تقرب خاص حاصل تھا۔غرۃ الکمال میں دریائے ابرار کے عنوان سے ایک قصیدہ خسرؔو نے حضرت نظام الدین کی مدح میں لکھا ہے۔جامؔی اور نوائی نے اس قصیدے کا جواب لکھا ہے۔تینوں کے پہلے مصرعے یہ ہیں

(۱) کوس شد خالی وبانگ غلغلش در دسر است

(۲) کنگرا ایوان شد کز کاخ ایوان برتر است

(۳) آتشیں لعلے کہ تاج خسروان راز یور است

شیخ کی مدح میں ایک قصیدہ کلیات مطبوعہ نول کشور میں شامل ہے۔ایک ترکیب بند بھی ہے۔علامہ زمان میر غلام علی آزاد بلگرامی اپنی کتاب خزانہ عامرہ میں تحریر کرتے ہیں۔کہ جس وقت امیر نے حضرت سلطان المشایخ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی نظم جو حضرت کی مدح لکھی تھی سنائی تو آپ خوش ہوئے۔اور فرمایا کے کیا صلہ چاہتے ہو۔انہوں نے عرض کیا کہ حضرت میرے کلام میں شیرینی پیدا کیجئے اور دعا فرمائے۔فرمایا ہماری چارپائی کے

نیچے طشت میں شکر رکھی ہے اس کو لا کر اپنے سر پر سے نثار کر اور تھوڑی سی اس میں سے کھا لے۔ امیر نے ایسا ہی کیا اور شیرینی کلام کی دولت سے مالا مال ہو گئے۔ بعد میں افسوس کیا کہ میں نے اس سے بہتر چیز کی دعا کے واسطے کیوں نہ خواہش کی۔ (خزانہ عامرہ، ص ۲۰۹)

نفحات الانس میں مولانا جامیؒ نے فرمایا ہے کہ ایک دن حضرت سلطان المشائخ کے اشارے سے امیر خسرو خواجہ خضر سے ملاقی ہوئے اور لعاب دہن کی خواہش کی حضرت خضر نے فرمایا یہ دولت تو شیخ سعدی کی قسمت میں تھی جوان کو مل گئی، امیر خسرو نہایت شکستہ دل ہو کر حضرت سلطان المشائخ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کل حال بیان کیا۔ حضرت نے اپنا لعاب دہن ان کے منہ میں ڈالا اور برکت اس کی ظاہر ہو گئی۔

ایک مرتبہ کا واقعہ کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء لب دریا کوٹھے پر بیٹھے ہندوؤں کے اشنان اور عبادت کے طریقے کو دیکھ رہے تھے امیر خسرو سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ ''ہر قوم راست راھے دینے وقبلہ گاہے'' یعنی ہر قوم سیدھے راستے پر ہے جو اپنا دین اور قبلہ بھی رکھتی ہے اس وقت نظام الدین اولیاء کی ٹوپی ذرا ٹیڑھی تھی امیر خسرو نے اس کی طرف اشارہ کر کے کہا ''من قبلہ راست کردم برطرف کج کلاھی'' یعنی میں نے ٹیڑھی ٹوپی پہننے والے کی طرف رخ کر کے اپنا قبلہ سیدھا کر دیا ہے۔

یہاں یہ ذکر بیجا نہ ہوگا کہ خسروؔ نے تقریباً اپنی سبھی مثنویوں میں نظام الدین اولیاء کی شان میں اشعار کہے ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ اشعار روایتی انداز کے ہیں۔ شاعر اپنے مرشد یا ممدوح کی شان میں شعر کہتا ہی ہے لیکن خسرو نے غزلوں میں بھی جگہ جگہ شیخ کی طرف اشارے کئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محبوب الٰہی کی شخصیت نے خسرو کے دل و دماغ کو مسحور کر رکھا تھا۔ اور غزلوں میں شعوری طور پر ان کا ذکر آ ہی جاتا تھا۔ یہ غزل ملاحظہ کیجئے۔ خسروؔ نے کسی کا نام نہیں لیا ہے۔ مگر صاف واضح ہے کہ ان کا مقصود دلبر معنوی ہے۔

ای میر ہمہ شکر فروشان
تو بہ شکن صلاح کوشان
عشاق ز دست چون تو ساقی
خونابہ بجای بادہ نو شان
در میکدہ غمت سفالی
نرخ ہمہ معرفت فروشان
در کاوش کنہ خوبی تو
کند است خیال تیز ہوشان
یک خرقہ غمت درست نگذاشت
در صومعہ کبود پو شان

حضرت نظام الدین اولیاء نے ۹۵ برس کی عمر پائی۔ جب ان کے انتقال کی خبر خسروؔ کو ملی تو وہ دلی سے باہر تھے۔ فوراً دہلی آئے جو مال ومتاع پاس تھا یاد شیخ طریقت میں لٹا دیا۔ مزار کی جاروب کشی کا فریضہ اختیار کیا۔ اپنے شیخ طریقت کے انتقال کی اندوہ ناک خبر سنتے ہی کپڑے پھاڑ ڈالے تھے۔ منہ پر کالک مل لی تھی اور اپنے مرشد کے مزار کی زیارت کے لئے روانہ ہو گئے۔ طبیعت مضمحل اور افسردہ رہنے لگی۔ خود ہی فرمایا کرتے تھے کہ اب میں زیادہ دیر زندہ نہیں رہوں گا۔ پورے چھ مہینے کہ بعد ان کی روح بھی قفس عنصری سے پرواز کر گئی،

خسروؔ کا ذہن تصوف کے رنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ شیخ کی تعلیم ان کی رگ و ریشہ میں سرایت کر گئی تھی۔ وہ اپنے مرشد کو غوث عالم، نظام ملت و دین، قطب ہفت آسمان ہفت زمیں، رہبر پیش بیں نائب مصطفٰے وغیرہ۔ ناموں سے یاد کرتے تھے اور فرمایا ہے۔

ملک وحدت بنام ایشان است بندہ خسروؔ وغلام ایشان است

ہشت بہشت میں حمد ونعت کے بعد خواجہ نظام الدین اولیاء کی مدح ہے اور یہ علاء الدین خلجی کی مدح سے پہلے درج ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ بادشاہوں کی مدح سے خواجہ کی مدح کو مقدم رکھتے تھے۔

خسرؔو اپنے بچپن میں جو کچھ کہتے تھے وہ شیخ کو دکھاتے تھے۔ یہ ان کا اپنا قول ہے چنانچہ خسرؔو نے طرز صفاہانیاں پر غزل سرائی شیخ کی فرمائش سے شروع کی تھی (سیر الاولیاء) اس لئے یہ گمان درست نہیں ہوسکتا کہ قران السعدین یا دوسری مثنویوں میں جو پہلے لکھی گئی تھیں۔ شیخ کی مدح کا نہ ہونا عدم تعلقات کا مظہر ہے لیکن چونکہ خمسہ کا آغاز شیخ ہی کی بشارت سے شروع ہوا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ اس وقت یہ خیال پیدا ہوا ہو اور بعد میں جاری رہا ہو۔

ماخذ

۱۔امیر خسرو از محمد وحید مرزا، الٰہ آباد، ہندوستان اکیڈمی، یو۔پی ۱۹۴۹ء

۲۔نفحات الانس از مولانا جامی، منشی نول کشور پریس

۳۔خزانہ عامرہ از آزاد بلگرامی، منشی نول کشور پریس

۴۔حیات امیت خسرو از خان بہادر تقی محمد خان خورجوی، ٹائمز پریس کراچی ۱۹۵۶ء

۵۔شعر العجم از شبلی نعمانی، ج دوم، دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

۶۔امیر خسرو احوال و آثار از نور الحسن انصاری کوہ نور پریس دہلی ۱۹۷۵ء

۷۔امیر خسرو عہد، فن اور شاعری از عرش ملسیانی۔

☆☆☆

خانم فروغ فرخزاد شخصیت و فارسی آثار

منیش کمار، ریسرچ اسکالر، شعبہ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

فروغ فرخزاد کا شمار نیما یوشیج کے پیرو کاروں میں ہوتا ہے۔ فروغ فرخزاد ۵ فروری ۱۹۳۵ء بمطابق ۱۳۱۳ھ ش میں رضا شاہ کبیر کے دورِ حکومت میں ایران کے شہر تہران میں پیدا ہوئی تھیں۔ ان کے والد کا نام سرہنگ فرخ زاد اور ماں کا نام بانو رانی تھا۔ حصول تعلیم کے لئے فروغ کو مکتب میں داخل کیا گیا، لیکن ابھی وہ اپنے متوسط درجے کی تعلیم بھی مکمل نہ کر پائی تھیں کہ والدین نے شاپو پرویز نامی ایک شخص سے ان کی شادی کرادی جہاں فروغ کے بطن سے ایک بیٹا بھی پیدا ہوا جس کا نام کامیاب رکھا گیا۔ لیکن فروغ کی ازدواجی زندگی ناکام رہی اور بہت جلدی طلاق ہو گیا۔ انہوں نے اپنی مختصر سی زندگی میں متعدد یورپی ممالک مثلاً فرانس، جرمنی، اٹلی، انگلینڈ کے سفر بھی کئے۔ فروغ ایک نہایت سلیقہ منداور مہربان عورت تھیں۔ ادب ، شاعری، فلم سازی، مصوری، کڑھائی کے ساتھ انہیں خاص دلچسپی تھی۔ جولائی ۱۹۵۶ء میں فروغ پہلی بار یورپ چلی گئیں۔ موسم بہار ۱۹۶۶ء میں فروغ دوسری بار یورپ گئیں۔ وہاں سے آکرانہوں نے ایک پبلشنگ ادارہ قائم کیا جس کے تحت ایک ماہنامہ اور دیگرادبی کتابیں شائع کرنے کا منصوبہ بنایا۔ ۲۳ سال کی عمر میں ۱۳۳۷ھ میں فروغ پہلی بار ہنر سینما کی طرف مائل ہوئیں اور بہت جلد انہوں نے اس فن میں مہارت حاصل کر لی۔ فلم کے ساتھ ساتھ فروغ کو ڈراموں میں بھی دلچسپی تھی۔ برناڈ شاہ کے ڈرامے Saint Joan کا انہوں نے ''ژان مقدس'' کے نام سے ترجمہ بھی کیا تھا۔ فروغ فرخ زاد ۱۳۴۵ھ ش/۱۹۶۶ء میں ایک کار کے حادثہ میں فوت ہوئیں۔ فروغ کی زندگی ہر قسم کی ریا و مکاری سے پاک تھی۔

خانم فروغ فرخزاد نیما یوشیج اور نادر نادر پور کی ہمعصر اور ہم نوا تھیں۔ ان کی شاعری کا موضوع مرد و زن کی مساوات اور عورتوں کی حمایت تھیں۔ ان کی شاعری میں مرد مغرور، قابض، بے وفا اور فاتح بدن ہے، جو محبت کے سحر سے ناواقف ہے اور ہر عورت کو استعمال کی چیز سمجھتا ہے۔ شاعری کی دنیا میں فروغ کا اپنا انفرادی مقام ہے۔ فارسی کی عشقیہ شاعری میں وہ ایک نیا لب و لہجہ لیکر داخل ہوئیں۔ ان کی نظموں کا پہلا مجموعہ جب شائع ہوا تو ایران کا ادبی حلقہ حیرت زدہ رہ گیا۔ اسے توقع نہیں تھیں کہ کوئی مشرقی عورت اپنے خصوصی جذبات کا اظہار اس قدر بے حجابی سے کر سکتی ہے۔ دراصل ایک جدید ایرانی عورت کی حیثیت سے فروغ نے اپنے آپ کو بہت سی سماجی زنجیروں سے آزاد کر لیا تھا، یہی رنگ ان کی شاعری میں جھلکتا ہے۔ ان کے کلام میں ایک قابل دید نقطہ ''استقلال دید'' اور ''شخصی تجربہ'' ہے۔ ان کی زبان ایک زندہ زبان ہے۔ ان کا کلام وزن اور قافیہ کی بندشوں سے آزاد ہے۔ تاثر کے اعتبار سے اگرچہ ایسی شاعری دلیر پا نہیں ہوتی لیکن اس میں ایک ایسا فنکارانہ شعور ہے جو ابتذال سے بچالیتا ہے۔ اس کی زندہ مثال فروغ کی نظم ''در برابر خدا'' ہے، جس میں انہوں نے خدا سے اپنے گناہوں کی معافی چاہی ہے۔

فروغ نے بڑی حساس طبیعت پائی تھی۔ معاشرتی روایات کی پرواکئے بغیر وہ اپنے جذبات کا برملا اظہار کرتی تھیں۔ فروغ کا پہلا مجموعۂ کلام ''اسیر'' ۱۳۳۱ھ ش/۱۹۵۵ء میں شائع ہوا تھا، جب فروغ کی عمر ۱۷ سال تھی۔ ''اسیر'' کی بیشتر نظمیں غنائی نوعیت کی ہیں اور ان نظموں میں فروغ کا رویہ خوش نگری اور باطن نگری کا ہے۔ ان نظموں میں فروغ اپنی انفرادیت کی تلاش میں سرگرداں نظر آتی ہیں۔ ''اسیر'' میں فروغ کی ۴۴ ابتدائی نظمیں شامل ہیں۔ یہ تمام نظمیں چاہے ان کا موضوع عشق ہو چاہے عواطف درونی، ایک خاص حرکیت سے عبارت ہیں۔

''اسیر'' کے بعد فروغ کا دوسرا مجموعہ ''دیوار'' ہے، جو ۱۳۳۵ھ ش/۱۹۵۶ء میں شائع ہوا تھا۔ ''دیوار'' میں فروغ کی فکر کا دائرہ وہی ہے، جو ''اسیر'' کا ہے لیکن تھوڑے پھیلاؤ کے ساتھ یہاں وہ جسمانی ہوس اور روحانی کسک کی حدوں میں داخل ہوتی نظر آتی ہیں۔ اس مجموعہ میں فروغ نے قربانی، آرزو، سپیدۂ عشق، برگور لیلی، اعتراف، یادیکروز، موج، شوق، قصہ ای درشب، پاسخ دیوار، ستیزہ جیسی نظمیں شامل کی ہیں۔ ''اسیر'' کی طرح ''دیوار'' میں بھی زیادہ تر نظمیں چار مصرعوں پر مشتمل ہیں۔

فروغ کا تیسرا مجموعۂ کلام ''عصیان'' ہے۔ یہ مجموعہ ۱۳۳۶ھ ش/۱۹۵۷ء میں شائع ہوا تھا۔اس مجموعہ میں عصیان خدائی،عصیان خدا،شعری برای تو،یوچ دلیر،صدا،ظلمت،از راہی دور،جنون،بعدھا،زندگی کے عنوان سے سترہ نظمیں شامل ہیں۔

''تولدی دیگر'' فروغ کا چوتھا مجموعہ ۱۳۴۲ھ ش/۱۹۶۳ء میں شائع ہوا۔''تولدی دیگر'' میں تنہائی اور مایوسی کے ساتھ ساتھ زندگی کی بے معنویت کا تصور بھی شدت سے محسوس ہوتا ہے۔''تولدی دیگر'' میں فروغ ایک ایسی شاعرہ کی حیثیت سے سامنے آئی ہیں، جہاں ان کی فکر زندگی سے بھر پور طور پر ہم آہنگ ہوگئی ہے۔فکر کی پختگی، بیان کی ہمہ گیری،اظہار کی ہنرمندی نے انہیں اس مجموعہ میں ایک زن تازہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ ''تولدی دیگر'' میں وسعت نگاہ کے ساتھ ساتھ فروغ کے اپنے موضوعات کے دائرے کو بھی وسیع تر کیا ہے۔احساس نومیدی،احساس تنہائی اور انفرادیت پسندی اور خود کی تلاش نے ''تولدی دیگر'' کو ان کے دور کا عہد نامہ بنا دیا ہے۔اس دیوان میں شامل تمام اشعار اجتماعی و انتقادی ہیں۔یہ دیوان اصل میں فروغ کی شخصیت اور افکار دونوں کا آیئنہ دار ہے۔

فروغ فرخزاد کا پانچواں مجموعۂ کلام ''ایمان بیاوریم'' ۱۳۵۲ھ ش/۱۹۶۲ء میں شائع ہوا۔ چھٹا مجموعۂ ''برگزیدہ اشعار'' ۱۳۵۳ھ ش/۱۹۶۴ء میں اور ساتواں مجموعۂ کلام ''گزینۂ اشعار'' ۱۳۶۴ھ ش/۱۹۶۶ء میں چھپ کر منظر عام پر آئے۔فروغ فرخزاد کے پہلے تین مجموعۂ کلام (اسیر، دیوار،عصیان) بے انتہا رومانٹک،سرکش اور محبت انگیز ہیں۔اس لئے کہ ان مجموعے میں مشرقی عورتوں کی خصوصی جذبات کی عکاسی کی گئی ہے۔فروغ کی زندگی میں اسیر،دیوار،عصیان،تولدی دیگر شائع ہو چکے تھے۔

فروغ کی شاعری فکر کی بجائے براہِ راست خواص کو مخاطب کرتی ہے۔ان کا عشق خالص ارضی اور جسمانی ہے، جو مادّیت اور روحانیت پر ترجیح دیتا ہے اور اپنے اظہار کے راستے میں نفسیاتی رکاوٹوں کو روا نہیں رکھتا۔تحلیل نفسی کا رجحان فارسی کی جدید عشقیہ شاعری میں ایک نمایاں حیثیت کا مالک ہے۔اس کا عکس فروغ کی شاعری میں خاص طور پر جھلکتا ہے، جس میں سلاست اور روانی پائی جاتی ہے۔فروغ کے اشعار میں فطرت کی تعریف کے ساتھ ساتھ اس کی زیبائی کی توصیف بھی خاص وقعت رکھتی ہے۔فروغ کی شاعری حسن و عشق کی شاعری ہے البتہ یہ بات ضرور ہے کہ اس کا رنگ و آہنگ نئے انداز کا ہے۔

فروغ فرخزاد نے جہاں شاعری کا کلاسیکی انداز اختیار کیا، وہیں آزاد نظمیں بھی کہی ہیں۔ان کی نظموں کے مضامین تازہ اور نئے ہوتے ہیں۔ فروغ نے ایک حساس طبعیت کے ساتھ ساتھ باریک بینی کی صلاحیت بھی پائی تھی۔اس لئے ان کی نظموں میں حقیقت کو جگہ دی ہے۔کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ہماری آپ بیتی سنا رہی ہیں اور یہی وجہ ان کے کلام کی خوبصورتی ہے۔ان کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں جو''بوسہ'' کے عنوان کے تحت کہے گئے ہیں۔

☆در دو چشمش گناہ می خندید
بررخش نورماہ می خندید
در گذر گہ آن لباس خموش
شعلہ مست آہ می خندید
☆شرمناک و پراز نیازی گنگ
بانگاہی کہ رنگ مستی داشت
در دو چشمش نگاہ کردم و گفت
باید از عشق حاصلی داشت
سایہ ای روی سایہ ای خم شد

در نهان گاہ راز پرور شب
نفسی روی گونہ ای لغزید
بوسہ ای شعلہ زد میان دو لب

رضا براہنی فروغ کے بارے میں لکھتے ہیں ''درفرخزاد یک من وجود دارد کہ حاکم بر ہمہ چیز است۔این من یک من تغزلی است کہ گاہی سراجتاعی درمی آوردوگاہی سرازفلسفہ''۔فروغ فرخزاد کے زندگی میں عشق کاایک خاص مفہوم ہےاوراسی مفہوم کے ساتھ انہوں نے سماج کوسمجھنے کی کوشش کی ہےاورذات کوبھی۔فروغ شعرمیں صرف ظرافت وزیبائی کی قائل نہیں تھیں۔ان کانظریہ ہے کہ شعرایک ایساتخلیقی عمل ہے جوتخلیق کار کے مکمل وجود سے جنم لیتا ہے۔فروغ شاعری کووجوداورزندگی کی بازیافت کاعمل سمجھتی ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ شاعری کے لئے مواد ہر چیز میں چھپا ہے،صرف محسوس کرنے اوراس کوڈھونڈنے کی ضرورت ہےلیکن یہ ڈھونڈنے کاعمل کسی کشف علمی سے کم نہیں ہے۔فروغ فرخزادشعرکہنااپنی زندگی کی ضرورت سمجھتی ہیں،ایسی ضرورت جوکھانے پینےاورسونے سے بڑھ چڑھ کرہے۔وہ شاعری کوایک ایساعمل قراردیتی ہیں،جولفظوں سے عبارت ہے۔فروغ لفظوں کووجودکاجزو سمجھتی ہیں اورشعرکولفظوں کاایساخارجی اظہارجس میں حیات قوت ومغالیت ہوتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ وہ جس بات پرزوردیتی ہیں،وہ یہ ہے کہ ہراس عیب سے بچناچاہیئے جولفظوں کےاس حیاتیاتی عمل میں مضرہو۔

فارسی کی جدیدعشقیہ شاعری میں فروغ فرخزادکامرتبہ بہت بلند ہے۔باوجودمخالفت اوردباؤکےفروغ نےاپناشعروادب کاسفرجاری رکھااور ہارنہیں مانی۔اپنے جذبات واحساسات کااظہارمعمول سے زیادہ کھلےالفاظ میں کیا۔جس کی وجہ سےانہیں مخالفتوں کاسامنا کرناپڑا۔مجموعی طورپرفروغ کی شاعری قابل قدرہے۔

﴿منابع وماخذ﴾

(۱)۔نیاایرانی ادب،ڈاکٹرظہورالدین احمد،نگارشات پبلشرزمیاں چیمبرز،۳ٹمپل روڈ،لاہور۔۲۰۰۰۔
(۲)۔فروغ فرخزاد،اسیر،چاپ یازدھم،تہران۲۵۳۵،مقدمہ شجاع الدین شفا۔
(۳)۔فروغ فرخزاد،تولدی دیگر،چاپ گلشن،انتشارات مروارید،تہران۔۱۳۶۹۔
(۴)۔فروغ فرخزاد،دیوار،چاپ ہشتم،امیرکبیرچاپ خانہ سپہر،تہران،۲۵۳۵۔
(۵)۔فروغ فرخزاد،عصیان،چاپ ہشتم،امیرکبیر،چاپ خانہ سپہر،تہران،۱۳۵۵۔
(۶)۔ادبیات جدیدایران،ڈاکٹرمنظرامام،کتابستان چندوارہ،مظفرپور(بہار)۔۱۹۹۶ء۔
(۷)۔سخنورانِ عہدپہلوی،ڈاکٹرغلام اشرف قادری،تخلیق کارپبلشرز،لکشمی نگر،دہلی۔۲۰۰۸۔
(۸)۔یحٰیی آرین پور،ازصباتانیما،جلداول ودوم،تہران۔۱۳۵۱۔

(English Books)

1. Browne Edward G, The Persian Revolution, Cambridge University Press, 1910 A.D
2. Browne Edward G, The Press and Poetry of Modern Persia, Cambridge University Press, 1914 A.D.
3. Munibur Rahman, Post Revolution Persian Verse, Institute of Islamic Studies, Aligarh Muslim University, Aigarh, 1955 A.D.

☆☆☆

شبلی نعمانی بحیثیت تنقید نگار شعر العجم کی روشنی میں

مکھن دین،ریسرچ اسکالرشعبہ فارسی علیگڑھ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

دنیائے ادب میں شعرالعجم کوجومقام حاصل ہوا۔وہ موجودہ ہندوستان کے ذوق فارسی کودیکھ کرتوقع سے بہت زیادہ ہے۔یہ فارسی ادب پرایک ایسی کتاب ہے جسکا جواب ہندوستان میں ملنامشکل ہے۔مولانا شبلی نے اس کتاب میں عجم کے شعراء پراس انداز سے تحقیق وتنقید کی ہے۔کہ ایران والے دیکھ کردنگ رہ گئے۔اب یہ کتاب فارسی ادب میں ایک اہم سرمایہ مانی جاتی ہے۔مولانا نے جس مدلل انداز میں شعر کی حقیقت اور ہرصنف پر تفصیل کے علاوہ شعراءکرام کے حالات زندگی کے ساتھ ساتھ ان کی تمام خوبیوں وخامیوں کا ذکر کیا ہے شاید ہی کسی ایرانی تنقید نگار نے اس انداز سے کیا ہو۔شعر العجم میں اصلاً اس پر بحث وگفتگو کی گئی ہے کہ فارسی شاعری کب اور کن حالات واسباب کے تحت وجود میں آئی۔عہد بہ عہد اس میں کیا ترقی ہوئی اس کے کیا طرز وانداز قایم ہوئے اسکی ہیت وصورت میں کیا کیا تبدیلی ہوتی رہی ملکی وقومی حالات نے اس پر کیا اثرات ڈالے اور خود اس نے ملک وقوم کو کس طرح متاثر کیا۔اس طرح یہ فارسی شاعری اوراس کی تاریخ دونوں کی بڑی اہم اور بلند پایہ تصنیف ہے۔اس کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا گیا اوراہل ایران نے بھی اس کی پزیرائی کی۔پروفیسر براؤن نے اس کی عظمت کا اعتراف کیا اوراپنی کتاب ''ہسٹری آف پرشن لیٹریچر'' میں اس سے استفادہ کیا۔

''شعرالعجم'' علامہ شبلی نعمانی کی معرکتہ الآراء تحقیقی وتنقیدی تصنیف ہے۔یہ فارسی ادب میں تنقید کی پہلی کتاب ہے۔اس سے قبل فارسی ادب میں تنقید کا رواج نہیں تھا۔صرف شعراء کے تذکرے ملتے ہیں۔جن میں ان کے منتخب کلام اوران کے مختصر حالات زندگی لکھے جاتے تھے۔علامہ شبلی نے شعرالعجم لکھ کر فارسی ادب میں تنقید کی بنیاد ڈالی۔

''شعرالعجم'' پانچ جلدوں پر مشتمل ہے۔پہلی تین جلدوں میں فارسی کے ممتاز شعراء کے حالات وکلام پر تبصرہ ہے۔چوتھی اور پانچویں جلد میں فارسی شاعری کی تمام اصناف سخن پر مدلل بحث کی گئی ہے۔شعرالعجم کی چارجلدیں مولانا کی زندگی میں شائع ہوئیں اور پانچویں جلد ان کی وفات کے بعد دارالمصنفین کی طرف سے شائع ہوئی۔شعرالعجم کی تصنیف کا کام ۱۹۰۶ء میں شروع ہوا۔

علامہ شبلی نے پہلے حصہ میں تمہید اور سبب تصنیف شعرالعجم کے ماخذ اور شعراء کی حقیقت بیان کرنے کے بعد رودکیؔ،دقیقیؔ،عنصریؔ،فرخیؔ،فردوسیؔ،اسدیؔ،طوسیؔ،منوچہریؔ،حکیم سنائیؔ،عمر خیامؔ،انوریؔ اور،نظامیؔ کے حالات پر تبصرہ کیا ہے۔دوسرے حصے میں خواجہ فریدالدین عطارؔ،کمال اسماعیلؔ،شیخ سعدیؔ ا،میر خسروؔ دہلوی،سلمان ساوجی خو،اجہ خافظ،اور تیسرے حصے میں فغانیؔ شیرازی،ملک الشعراءؔ،فیضیؔ،عرفیؔ،نظیری نیشاپوری،طالب آملی،صائب اصفہانی،اورابوطالب کلیم کے حالات پر مفصل ومدلل تبصرہ ہے۔چوتھے اور پانچویں حصے میں جواس کتاب کی روح ہے۔شاعری کی حقیقت اور ماہیت ہے۔فارسی تاریخ کی عام تاریخ،شاعری پر تمدنی حالات،دیگر اسباب کا اثر وغیرہ بیان کرنے کے بعد فارسی کی رزمیہ شاعری پر ریویو ہے۔پانچویں حصہ میں بقیہ اصناف سخن یعنی قصیدہ،غزل،عشقیہ صوفیانہ،فلسفیانہ اوراخلاقی شاعری پر تقریظ وتبصرہ ہے۔

جس زمانے میں علامہ شبلی نعمانی ''شعرالعجم'' کی تالیف وترتیب میں مصروف تھے۔اس موضوع پر ہندوستان اور یورپ کے دونامور مصنفین بھی مصروف کار تھے۔ہندوستان میں شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد اورانگلستان میں پروفیسر براؤن۔ہندوستان میں مولانا آزاد کی ''سخندان پارس'' شائع ہوئی۔اورانگلستان میں پروفیسر براؤن کی ''لٹریری ہسٹری آف پرشیا'' لیکن علامہ شبلی نعمانی کا معیار نقد ان دونوں سے الگ اور افضل تھا۔

آزاد کی ''سخندان پارس'' کے بارے میں ۶ مئی ۱۹۰۷ء کے ایک خط میں شبلی صاحب لکھتے ہیں۔

آزاد کا ''سخندان پارس'' حصہ دوم نکلا۔سبحان اللہ میرے شعرالعجم کو ہاتھ نہیں لگایا۔

علامہ شبلی نعمانیؔ شاعری کو ذوقی اوروجدانی چیز سمجھتے ہیں۔ان کے خیال میں شاعری کی جامع اور مانع تعریف نہیں کی جاسکتی۔ان کے

نزدیک شاعری کا منبع ادراک نہیں احساس ہے اور یہی احساس جب الفاظ کا جامہ پہن لیتا ہے تو شعر بن جاتا ہے وہ لکھتے ہیں۔

''شاعری ایک آگ ہے جو خود بخود مشتعل ہوتی ہے۔ایک چشمہ ہے، جو خود ابلتا ہے ایک برق ہے جو خود کوندتی ہے''

علامہ شبلی نعمانی کا خیال تھا کے جو جذبات الفاظ کے ذریعہ سے ادا ہوں وہ شعر ہیں۔اس سے پتہ چلتا ہے کے شبلی شاعری کے قائل تھے۔جذبات کے بغیر شاعری کا وجود نہیں ہوتا۔جذبات سے مراد ہنگامہ و ہیجان پیدا کرنا نہیں بلکہ جذبات میں زندگی اور جوانی پیدا کرنا ہے۔ان کے خیال میں شاعری فنون لطیفہ میں بلند اور برتر حیثیت رکھتی ہے اور وہ سرخوشی بن کر حواس پر چھا جاتی ہے شبلی محاکات کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''محاکات کے معنی کسی چیز یا کسی حالت کا اس طرح ادا کرنا ہے کہ اس شئیے کی تصویر آنکھوں میں چھا جائے''

شاعری کے لئے محاکات کی صلاحیت کا ہونا لازمی ہے۔اس کے لئے تخیل کی بلندی لازمی چیز ہے۔شاعری میں جس قدر تخیل بلند درجہ کا ہوگا۔اسی قدر شاعری اعلی درجے کی ہوگی۔شعر و شاعری کی اہمیت واضح کرتے ہوئے شبلی نے تشبیہ و استعارہ کی اہمیت پر زیادہ زور دیا ہے۔تشبیہ و استعارہ کا حسن اس کی ندرت و جدت میں ہے۔اس جدت کو اسلوب و طرز ادا کیا جاتا ہے۔نئے اسلوب اور نئے انداز کے بغیر شاعری میں دلکشی نہیں پیدا ہوتی۔انداز و اسلوب کی تعمیر میں الفاظ بڑا کام کرتے ہیں۔کیونکہ الفاظ کا حسن ہی شاعری کو دلکش بناتا ہے۔شبلی صاحب کا خیال ہے کہ

''شاعری یا انشاء پردازی کا مدار زیادہ تر الفاظ پر ہی ہے۔گلستان میں جو مضامین اور خیالات ہیں ایسے اچھوتے اور نادر ہیں۔لیکن الفاظ میں فصاحت اور ترتیب و تناسب نے اس میں جو سحر پیدا کر دیا انہیں مضامین یا خیالات کو معمولی الفاظ میں ادا کیا جائے تو سارا اثر جاتا رہے گا''

علامہ شبلی نعمانی فارسی کے مشہور شاعر دقیقی کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ۔

''سب سے پہلے جس نے فارسی زبان کو عربی کی آمیزش سے پاک کر کے زبان کی حیثیت قائم کی وہ دقیقی ہی ہے اس کے سیکڑوں اشعار پڑھ جاؤ عربی کا لفظ نہیں آتا۔دقیقی کی بدقسمتی دیکھو کہ اس فخر کا تاج شہرت کے ہاتھوں نے اس سے چھین کر فردوسی کے سر پر رکھ دیا۔

اس نے بعض غزلیں مسلسل لکھیں ہیں۔اور یہ اس زمانے کے لحاظ سے بلکل نئی بات تھی۔جس کو لوگ نیچرل شاعری کہتے ہیں۔فارسی میں غالباً سب پہلے اسی نے اس کی بنیاد قائم کی''

اس طرح عنصری کے قصیدے کے متعلق شبلی صاحب لکھتے ہیں کہ۔

''عنصری نے ترجیح شراب میں جو قصیدہ لکھا ہے۔وہ اس قدر مقبول ہوا کہ تمام شعرا مابعد نے اس کی تتبع میں قصائید لکھئے''

اسی طرح فرخی کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے اس کا درجہ اس طرح متعین کرتے ہیں۔''فرخی اور قاآنی کا موازنہ کرو صاف نظر آئے گا کہ جو بات قاآنی کو ہزار برس کے بعد حاصل ہوئی''

شبلی نعمانی فردوسی کے متعلق اس طرح رقم طراز ہیں کہ

''اس کی قدرت زبان دیکھو ساٹھ ہزار شعر لکھے اور عربی الفاظ اس قدر کم ہیں کہ گویا نہیں ہیں۔شاہنامہ اگر چہ بظاہر رزمیہ نظم معلوم ہوتی ہے۔لیکن تمام واقعات کے بیان میں تفصیل سے ہر قسم کے حالات آتے جاتے ہیں کہ کوئی شخص چاہے۔تو صرف شاہنامہ کی مدد سے اس زمانے کی تہذیب و تمندن کا پورا پتہ لگا سکتا ہے۔اس کو تقدس کا دعوی نہیں لیکن حسن و عشق کا کہیں موقع ہوتا ہے۔تو آنکھیں نیچی کر لیتا ہے۔اور صرف واقعہ نگاہی کے فرض کے لحاظ سے ایک سرسری غلط انداز نگاہ ڈالتا ہوا گزر جاتا ہے۔عام خیال ہے کہ وہ بزم اچھی نہیں لکھتا لیکن شاہنامہ میں جہاں جہاں بزم کا موقع آیا ہے شاعری کا چمن زار نظر آتا ہے۔شاعری کا اصل کمال واقعہ نگاہی اور جذبات انسانی کا اظہار ہے۔ان دونوں باتوں میں وہ تمام شعراء کا پیشرو اور امام ہے۔

اسی طرح اسدی طوسی کی شخصیت کو صرف ایک جاندار جملے میں اس طرح مقید کرتے ہیں،

اقلیم سخن رزم کا یہ دوسرا تاجدار ہے صاحب آتش کدہ نے اس کو سلطان محمود کی سبعہ سیارہ میں شمار کیا ہے اسی طرح رباعی کے مشہور شاعر عمر خیام کے متعلق لکھتے ہیں کہ

یہ عجیب بات ہے کہ خیام فلسفہ میں، نجوم میں، فقہ میں، ادب میں تاریخ میں، کمال رکھتا تھا۔لیکن اس کے ساتھ اس کا افق شہرت بلکل تاریک ہے۔جس چیز نے ۸سو برس تک اس کے نام کو زندہ رکھا وہ چند فارسی رباعیاں ہیں اور اسی کے شہرت کے بال و پر ہیں۔ان رباعیوں کے ساتھ مسلمانوں نے جس قدر اعتبار کیا۔اس سے ہزاروں درجے بڑھ کر یورپ نے کیا۔

شبلی نعمانی فارسی کے مشہور شاعر انوری کو فردوسی اور سعدی کے ہم پایہ تسلیم نہیں کرتے اس کو شریعت ہجو کا پیغمبر قرار دیتے ہوئے اس کے متعلق لکھتے ہیں۔

''ایران میں تین شاعر پیغمبر سخن تسلیم کیے گئے۔فردوسی، انوری، اور سعدی لیکن اس سے بڑھ کر کیا ہوسکتا ہے۔کہ فردوسی اور سعدی کے پہلو میں انوری کو جگہ دی گئی وہ قصیدہ گوئی کا پیغمبر سمجھا جاتا ہے۔جس طرح فردوسی اور سعدی مثنوی میں اور غزل میں یکتا تھے۔لیکن قصیدہ کا جو انداز چلا آتا تھا، اس پر انوری نے کچھ اضافہ نہیں کیا۔انوری کے پیغمبری کے ثبوت میں کوئی معجزہ موجود نہیں ہے۔انوری کا سرمایہ فخر ہجو ہے کچھ شبہ نہیں کہ اگر ہجو گوئی کی کوئی شریعت ہوتی تو اس کا پیغمبر ہوتا۔

علامہ شبلی نعمانی صوفیانہ شاعری میں فریدالدین عطار کے متعلق یوں رقمطراز ہیں۔

''صوفیانہ شاعری کے چار ارکان ہیں۔سنائی، اوحدی، مولانا روم، اور خواجہ فریدالدین عطار، خواجہ صاحب نے تصوف کے جو خیالات ادا کیے ہیں۔وہ سنائی سے زیادہ دقیق نہیں ہیں لیکن زبان اس قدر صاف ہے۔کہ اس وصف کا گویا ان پر خاتمہ ہوگیا۔ہر قسم کہ خیالات اس بے تکلفی، روانی، اور سادگی سے ادا کرتے ہیں۔کہ نثر میں بھی اس سے زیادہ صاف ادا نہیں ہوسکتے۔اس کے ساتھ قوت تخیل بھی اعلی درجے کی ہے۔بہت سے نئے مضامین پیدا کیے اور جو پہلے بندھ چکے تھے۔ان کو ایسے نئے پہلو سے ادا کرتے ہیں۔کہ بلکل نیا مضمون معلوم ہوتا ہے۔

فارسی کے مشہور ترین شاعر سعدی شیرازی کے متعلق علامہ شبلی صاحب ''شعرالعجم''میں یوں رقمطراز ہیں،

''وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے غزل میں زاہدوں اور واعظوں کا پردہ فاش کیا۔ان کے بعد اگرچہ غزل میں بہت ترقی ہوئی۔خواجہ حافظ نے اس عمارت کو اس قدر بلند کردیا کہ طاہر خیال بھی وہاں تک نہیں پہونچ سکتا۔لیکن غور سے دیکھو تو اکثر مضامین اور طرز خیال کی داغ بیل شیخ نے ڈالی تھی۔وہ فطرتاً شاعر تھے۔زبان خداداد تھی ان باتوں نے مل کر ان کی غزل میں اثر پیدا کردیا تمام ایران میں آگ لگ گئی۔

اس طرح امیر خسرو کے متعلق لکھتے ہیں کہ۔

''ہندوستان میں چھ سو برس سے آج تک امیر خسرو کے درجے کا جامع کمالات پیدا نہیں ہوا۔اور سچ پوچھو تو اس قدر گوناگوں اوصاف کے جامع ایران اور روم کی خاک نے بھی ہزاروں برس کی مدت میں دو چار ہی پیدا کئے۔

فارسی غزل کے بادشاہ حافظ شیرازی کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے علامہ شبلی لکھتے ہیں کہ۔

''حافظ شیرازی کو شاعری کے تمام اصناف پر قدرت حاصل تھی۔ان کے قصیدے بھی کم نہیں۔مثنوی میں جو صفائی، لطافت اور زور ہے کہ نظامی اور سعدی کا دھوکہ ہوتا ہے۔لیکن ان کا اصلی اعجاز غزل گوئی ہے۔یہ عموماً مسلم ہے کہ عالم وجود میں آج تک کوئی شخص غزل میں اس کا ہمسر نہیں ہوسکا۔

اسی طرح ''شعرالعجم''تیسری جلد میں ہندوستان کے باکمال شعراء کا ذکر ہوتے ہوئے۔عرفی شیرازی کے متعلق اپنی رائے اس طرح قائم کرتے ہیں۔

''زور کلام جس کی ابتداء نظامی نے کی۔اس کو کمال کے درجے تک پہونچا دیا اس نے سیکڑوں نئی نئی ترکیبیں اور نئے نئے استعارے پیدا کیے۔جن سے جذبات اور طرفگی کے علاوہ نفس مضمون پر خاص اثر پڑا۔دوست اور دشمن دونوں نے اس کی مضمون آفرینی اور نازک خیال کا اقرار کیا۔اس کا ہر شعر جدت کی ایک نئی مثال ہے۔اس کا زور طبع اور فصاحت و بلاغت اور سوز دہاں نظر آتا ہے۔جہاں وہ قصائد میں کوئی مسلسل مضمون ادا کرتا ہے' اسی طرح نظیری کے متعلق لکھتے ہیں۔

''الفاظ کے تراشنے کی شریعت کا اولوالعزم پیغمبر نظیری ہے''

اسی طرح فارسی کے مشہور شاعر صائب کا تذکرہ کرتے ہیں۔

''ایران کی شاعری رودکی سے شروع ہوئی اور مرزا صائب پر ختم ہوگئی۔اس کا خاص انداز تمثیل ہے۔تمثیل کا طریقہ پہلے بھی تھا،لیکن صائب نے اس کثرت سے اس کو برتا کہ اس کی چیز ہوگئی۔اس نے اس کو اخلاقی مضامین کے لئے خاص کر دیا''

''شعرالعجم'' کی چوتھی جلد میں شعروشاعری کی عظمت ایران میں شاعری کیونکر پیدا ہوئی۔فارسی شاعری کا اثر عرب پر دغیرہ جیسے عنوانات کے علاوہ لطافت الفاظ حسن ترکیب،لطافت خیال اور پھر فردوسی کے شاہنامہ پر علامہ شبلی نے بہت ہی ناقدانہ وفاضلانہ تبصرہ کیا ہے شاعری پر آب وہوا اور سرسبزی کے جو خیالات رونما ہوتے ہیں۔ان کے متعلق علامہ شبلی لکھتے ہیں۔

''ملک کی آب وہوا سرسبزی وشادابی کا اثر خیالات پر پڑتا ہے۔اور اس کے ذریعے سے انشاپردازی اور شاعری تک پہونچتا ہے۔عرب جاہلیت کا کلام دیکھو تو پہاڑ صحراء،جنگل،بیابان،دشوار گزار راستے ببولوں کے جھنڈ،یہ چیزیں ان کی شاعری کا سرمایہ ہیں۔لیکن یہی عرب جب بغداد میں پہونچے تو ان کا کلام چمنستان اور شبستان بن گیا۔

''شعرالعجم'' کی پانچویں جلد میں شاعری کے تمام اصناف پر مدلل تبصرہ ہے اور ہر صنف کے ارتقاء اور خصوصیات پر تبصرہ اور نقد بھی کیا ہے۔

قصیدہ کے باب میں مولانا شبلی رقم طراز ہیں،

''جس زمانہ میں شاعری کا آغاز ہوا۔عرب شاعری مدحیہ عقائد پر محدود تھی اس لئے ایرانی شعراء نے بھی انہیں کی تقلید کی ہے۔اس کے ساتھ صلہ اور انعام کی توقع صرف قصیدہ سے ہوسکتی ہے۔یہ اسباب تھے کہ ایران نے سب سے پہلے قصیدہ گوئی کی ابتداء کی''

عرب میں مدحیہ قصائد کا انداز یہ تھا۔کہ تمہید میں عشقیہ اشعار ہوتے تھے۔جن کو تشبیب کہتے ہیں،پھر کسی تقریب سے ممدوح کا ذکر کرتے تھے اس کو اصطلاح میں تخلص یا گریز کہتے ہیں۔پھر مدح ہوتی ہے،اور دعا پر خاتمہ ہوتا ہے۔آگے چل کر پھر قصیدہ کی خصوصیات واضح کرتے ہوئے علامہ شبلی لکھتے ہیں کہ:

عرب شعراء نے جن لوگوں کا ذکر قصیدہ میں کر دیا ہے۔ان کا نام آج تک زندہ ہے۔ایرانی شعراء نے اپنے ممدوحوں کی شان میں زمین وآسمان کے قلابے ملا دیے۔لیکن ان کا نام بھی کوئی نہیں جانتا۔

علامہ شبلی نعمانی نے فارسی کے مشہور قصیدہ نگاروں مثلاً انوری،ظہیر فاریابی،خاقانی،محتشم کاشی،کمال اسماعیل،عرفی،قدسی قاآنی،مشہدی،غالب وغیرہ کے قصائد پر سنجیدہ اور متوازن تبصرہ کیا ہے۔علامہ شبلی غزل کے باب کی ابتداء شعرالعجم میں اس طرح کرتے ہیں۔

''عشق ومحبت انسان کا خمیر ہے اس لئے جہاں انسان ہے وہاں عشق بھی ہے۔اور چونکہ کوئی قوم شاعری سے خالی نہیں اس لئے کوئی قوم عشقیہ شاعری سے خالی نہیں ہوسکتی'' غزل کی ترقی کے اسباب سے بحث کرتے ہوئے علامہ شبلی لکھتے ہیں کہ

غزل کی تحریک عشق ومحبت کے جذبات سے ہوتی ہے۔لیکن ایران میں مدت تک جنگی جذبات کا زور رہا۔غزل کی ترقی کی تاریخ تصوف سے شروع ہوتی ہے۔تصوف کا تعلق تمام تر واردات اور جذبات سے ہے۔اور اس کی تعلیم کی پہلی ابجد عشق ومحبت ہے،تصوف کی ابتداء اگرچہ تیسری صدی کے آغاز میں ہوئی لیکن پانچویں صدی اس کے اوج شباب کا زمانہ ہے۔اور یہی زمانہ غزل کی ترقی کا پہلا نوروز ہے۔آگے چل کر غزل اور قصیدہ کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

''غزل کو ایک مدت تک قصیدہ کے مقابلہ میں عروج حاصل نہ ہوسکا،کیونکہ شروع میں غزل کا اصلی عنصر قصیدہ ہی تھا۔قصیدہ میں ممدوح کی تعریف کی جاتی ہے اور غزل میں معشوق کی،غزل کی تحریک عشق ومحبت کے جذبات سے ہوتی ہے لیکن ایران میں مدت تک جنگی جذبات کو زور دیا' فارسی غزل کا تذکرہ کرتے ہوئے علامہ شبلی نعمانی رودکی،دقیقی،اوحدی سنائی،عطار،روم،عراقی،سعدی،سلمان،حافظ،نظیری،ظہوری طالب آملی،کلیم،اور بیدل، کی

غزلیہ شاعری پر بہت ہی جامع تبصرہ کیا ہے۔

علامہ شبلی نعمانی کا تنقیدی و تحقیقی شعور بہت نکھرا ہوا تھا۔عربی اردو اور فارسی ادبیات میں انہیں عبور حاصل تھا۔انہیں شعر و ادب سے بہت لگاؤ تھا۔انہوں نے تنقید کے عملی و نظری دونوں پہلوؤں کی طرف توجہ کی۔ان کا خاص میدان شاعری کی تنقید ہے۔انہوں نے شاعری کے اصولوں پر بحث کی۔اصناف سخن کے اصول وضع کیے اور شاعری پر عملی تنقید بھی کی۔ان کی معرکتہ الآرا تنقیدی تصنیف ''شعر العجم ''اس لحاظ سے خصوصیت کے ساتھ اہمیت رکھتی ہے۔ان کی اس تصنیف کو سامنے رکھ کر ان کے انداز تنقید کا صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔انہوں نے اس میں جو تنقیدی نظریات پیش کیے ہیں اور ان میں سے ہر ایک پر بصیرت افروز اور خیال انگیز بحث کی ہے وہ قابل داد ہیں۔ان کا انداز بحث منطقی اور استدلالی ہے انہوں نے جو باتیں بھی کہیں ہیں دلیل کے ساتھ کہی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کی یہ بحث مشکل،خشک اور بے مزہ نہیں ہے۔وہ ''شعر العجم '' کی ابتداء اس شاعرانہ اور خطیبانہ انداز میں کرتے ہیں،''اسلام ایک ابر تھا اور سطح خاک کے ایک ایک چپے پر برسا'' علامہ اقبالؔ نے شبلی نعمانی اور ''شعر العجم '' کے بارے میں کہا تھا کہ۔

''میرے نزدیک شبلی نعمانی میں ایسی نادر صفات موجود ہیں جنہوں نے ان کو ''شعر العجم '' کے مصنف بننے کا اہل بنایا۔اول تو ان کی تاریخ دانی دوم ان کی عربی دانی سوم شعر و سخن کا صحیح مذاق اور خود شاعر ہونا'' ''شعر العجم '' کے متعلق مہدی افادی صاحب لکھتے ہیں کہ:

''شعر العجم '' تنقید عالیہ (ہائی کریٹیسیزم) کا بہترین نمونہ ہے۔بلکہ انہیں اصرار ہے کے صرف اردو لیٹریچر میں نہیں بلکہ مشرق کی کسی زبان میں اس کے پایہ کی کوئی تصنیف موجود نہیں۔اور یہ دنیا کی شیریں زبان کے جذباتی لٹریچر کا ایک خوبصورت مرقع ہے' کہنا پڑتا ہے کہ شبلی کا زاویہ نظر شبلی کی تنقید کا ساز و سامان ہے۔شبلی کا اسلوب ان کی سب چیزوں میں پرانی تنقید کی صاف کارفرمائی ہے،تنقید کے نئے اصول،نیا تنقیدی زاویہ،نظر اور نئی تنقیدی تکنیک یہ سب چیزیں کہیں نہیں ملتیں۔

ان سب تنقیدوں کے باوجود مولانا شبلی کی فضیلت علمی مسلم ہے۔مولانا کا اصل شاہکار ''شعر العجم '' کا چوتھا اور پانچواں حصہ ہے اور انہیں حصوں سے شبلی کی جامعیت،دقت نظری،بلندی مذاق،فارسی زبان کے صحیح ذوق اور قوت انشاپردازی کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ان کا اصل مقصد تذکرہ شعراء لکھنا نہیں تھا۔جہاں تک محمود شیرانیؔ اور اسلم جیراجپوری کی تنقید کا سوال ہے۔یہ حقیقت ناقابل تردید ہے کہ شبلی علم و ادب کے جن جن میدانوں سے ایک شہ سوار کی طرح فاتحانہ انداز میں گزر جاتے ہیں۔ان میں سے اکثر میدانوں میں جیراجپوری و شیروانی صاحب قدم بھی نہیں رکھ سکتے۔

سید صباح الدین عبدالرحمانؔ ''شعر العجم '' کے تقدس میں اضافہ کرتے ہوئے ان کے متعلق لکھتے ہیں کہ

''یہ جلدیں اردو زبان و ادب کی تو نہیں۔لیکن اردو زبان و ادب میں تنقید نگاری کی زبورا،ور توریت،کی حیثیت رکھتی ہیں۔جن کے ذریعہ سے شعر فہمی کی آیات معلوم ہونگی''

علامہ شبلی مرحوم زمانہ حال کے ان چند مستند فاضل میں سے ہیں۔جن کا وجود مسلمانوں کے لئے ہمیشہ مایہء ناز رہے گا۔ان کی متعدد تصانیف نے آسمان علم پر ان کو آفتاب بن کر چمکایا۔اب تک فارسی اور اردو میں جس قدر کتابیں لکھی گئی ہیں ''شعر العجم ''ان میں بغیر کسی استنبار کے بہترین تالیف مانی جا سکتی ہے۔

ماخذ۔

۱۔شعر العجم حصہ اول ص۷۳

۲۔شعر العجم حصہ اول ص۱۶۹ تا ۱۷۰

۳۔شعر العجم حصہ اول ص۲۰۲،۳

۴۔شعر العجم حصہ اول ص۲۵۸

۵۔شعر العجم حصہ دوم ص۱۰

۶۔شعر العجم حصہ سوم

۷۔شعر العجم حصہ چہارم

۸۔شعر العجم حصہ پنجم ص۴۷

☆☆☆

کرشن چندر کے افسانے اور ان کا فن
(تاثراتی اسلوب میں حقائق کی کھوج)

تکیر وموریاما، ریسرچ اسکالر،شعبہ اردو،بی۔ایچ۔یو،وارانسی،۲۲۱۰۰۵

نقادوں نے کرشن چندر کے فنی تجزیے میں کسی قدر عجلت پسندی سے کام لیتے ہوئے رومانیت کوان کے فن کا ستون قرار دیا ہے۔اس میں شک نہیں کہ کرشن چندر کے افسانوں میں بعض رومانی پہلو پائے جاتے ہیں۔لیکن ان چند پہلوؤں کی بناپر رومانیت کوان کے فن کی اساس ٹھہرانا یا انھیں رومانی افسانہ نگاروں کے زمرے میں شمار کرنا مطلق بجا نہیں ہے کیونکہ ان کی مٹھی بھر کی ابتدائی کہانیوں کو چھوڑ کر باقی بیشتر افسانوں میں انھوں نے تخیل آمیز واقعات اور خیالی قلبی واردات کے بجائے اصلی زندگی کی کئی متلاطم کیفیتوں کو ہی اپنا خاص موضوع بنایا ہے۔جہاں تک میرا خیال ہے کہ جو شخص کرشن چندر کی تخلیقات میں رومانی عناصر کا سراغ ڈھونڈتے ہیں وہ ان کے ظاہری اسالیب ہی کوان کے افسانوں کی جان خیال کرتے ہیں، نہ کہ مواد واسالیب کی خوبصورت آمیزش کو۔حقیقت یہ ہے کہ کرشن چندر ایک تاثراتی افسانہ نگار ہیں۔انھوں نے اپنے داخلی شعور کے آئینے میں تمام انسانوں کے باطنی رشتوں اوران کے دائمی جذبات واحساسات کواجاگر کر کے زمانے کے ظلم وتشدد اور طبقاتی سماج کی ناانصافیوں اور ناہمواریوں کوفنا کرنے کی سعی کی ہے۔ان کے ہاں اسلوب محض ذریعۂ اظہار نہیں ہے بلکہ یہ پوری دنیا کوان کے افکاروخیالات سے متفق کرنے اوراُسے محبت واخوت کے جذبات سے معمور کرنے کی سبیل بھی ہے۔چنانچہ ان کے افسانوں میں بیان کے استقلال واستقامت اور موضوعات کے دوام کا احساس صاف ملتا ہے۔

اسلوب اور مواد کا باطنی تعلق

کرشن چندر کے افسانوں میں خارجیت ہمیشہ نفسیاتی معنویت کی حامل ہوتی ہے۔ان کے ہاں فضابندی،منظرکشی اور کرداروں کی شخصیت نگاری کو تاثراتی پیرایوں کے ذریعے پیش کیا گیا ہے۔بالعموم تاثرتی اندازِ بیان کا ایک خاص پہلو یہ خیال کیا جاسکتا ہے کہ قارئین خود افسانہ نگار کی حسیت اوراس کے ذہنی رجحانات کے مطابق کہانی کے تمام حالات وکوائف کا جائزہ لے سکتے ہیں اور وہ لاشعوری طور پر افسانے کے جذباتی تموج میں شریک ہوکرفن کار کے خیالات ونظریات سے متفق ہوسکتے ہیں۔لیکن کرشن چندر کا جوہر کمالات یہ ہے کہ ان عمومی فوائد کےعلاوہ ان کا اسلوب فضا اور کرداروں کی داخلی وخارجی تشکیل اورامتزاج میں بھی معاون رہتا ہے۔مثلاً وہ اپنے افسانے ''آنگی'' میں فطری مناظر کی تصویر کو کھینچتے ہوئے یوں بیان کرتے ہیں۔:

> مسافر نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی۔آسمان کے گہرے نیلے سمندر میں بادلوں کے سفید سفید ٹکڑے برف کے بڑے بڑے تودوں کی طرح تیر رہے تھے اوران کے قریب چیلیں منڈلا رہی تھیں۔چیلیں۔اس نے ہانپ کے اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھا۔اب کوئی گاؤں قریب ہی ہوگا۔چیلیں انسانی آبادی کا نشان ہیں۔اس نے دل میں سوچا۔گدھ،کوّے،چیلیں۔انسان۔ان جانوروں کی صفات ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں۔اسی طرح سوچتا ہوا عالم حیوانات کی خصوصیت کے متعلق مختلف نظریئے قائم کرتا ہوا وہ بہت سارا راستہ طے کر گیا۔

یہاں مرکزی کردار کوقدرت کے لامتناہی مناظر میں خود اپنی نفسیاتی کیفیت کا عکس علامتی طور پر نظر آتا ہے۔آسمان میں اڑتے ہوئے پرندوں کو دیکھتے ہی انسانی درندگی اور مکارانہ وعیارانہ رویوں کی یادیں اسے ستانے لگتی ہیں۔دراصل وہ شہری زندگی کے ان منفی عناصر سے فرار ہونے کے

لئے یہاں تک آ پہنچا ہے۔لیکن ظاہر ہے کہ وہ خود شہر کے تہذیبی وثقافتی ماحول کا پروردہ ہے اور اس کے اندر یہی تہذیبی ستم ظریفی، دروغ گوئی اور چالا کی مخفی رہتی ہیں۔ وہ ان مناظر کو دیکھ کر اپنی اندرونی خصلتوں سے از سرِ نو آشکار ہو جاتا ہے۔ اور اسے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس کے لیے دنیا میں کوئی مفر کی جگہ نہیں۔

کرشن چندر خارجی تاثرات میں باطنی حقائق کے نشانات کو ڈھونڈنے کے عادی ہیں۔ وہ کردار کی ظاہری شکل وصورت کو بھی اس کے اندرونی اوصاف اور دلی کیفیت کے مظہر کے طور پر دیکھتے ہیں۔ وہ ''جہلم میں ناؤ پر'' میں ایک دوشیزہ کے اندرونی محاسن اور سیرت کو اس کے حسن و جوبن سے تعبیر کرتے ہیں۔:

> لڑکی نے میری طرف دیکھا۔ اگر میں یہ کہہ دوں کہ اس جیسا خوبصورت اور بھولا چہرہ میں نے آج تک نہیں دیکھا تو یقیناً ایک جھوٹ ہوگا، لیکن یہ کہہ دینے میں مجھے ذرا بھی تامل نہیں کہ اس کے چہرے میں کچھ ایسی عجیب کشش اور موہنی تھی جس نے مجھے ایک دم مسحور کر لیا۔ صرف ایک لمحے کے لئے اس نے میری طرف دیکھا پھر وہ گھنی گھنی پلکیں اس کے رخساروں پر جھک گئیں۔ وہ کشمیر کے حسن صبیح کا ایک نادر نمونہ تھی، دلکش خدوخال، سرو قد، دلاویز رنگت۔ لیکن جس چیز نے مجھے زیادہ متاثر کیا وہ اس کی ظاہری خوبصورتی سے بھی بڑھ کر اس کی نگاہوں کا حزن و ملال تھا جسے میں ایک جھلک ہی میں پا گیا۔ اف، وہ المناک گہرائیاں! اس ایک لمحے میں مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں بجلی کی سی سرعت کے ساتھ کسی گہرے سمندر میں ڈوبا جا رہا ہوں۔ پھر یکا یک مجھے ٹھوکر سی لگی اور میں نے اپنے آپ کو کنارے پر پایا۔ کس قدر عجیب احساس تھا، مگر یہ احساس صرف ایک لمحے تک ہی محدود تھا۔ دوسرے لمحے میں وہ جہلم کے پھیلے ہوئے پانیوں کی طرف متجسس نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ اب اس کا چہرہ صاف اور بھولا بھالا تھا، ہر قسم کے جذبات سے عاری۔ میرے دل پر ایک نیم اضطراری کیفیت طاری ہوگئی۔

دریا کے کنارے پر مرکزی کردار کی ملاقات ایک حسینہ سے ہوئی ہے۔ اسے بے ساختہ اس کے رخِ انور پر اس کی پاکیزہ وشفاف شخصیت کا عکس دکھائی دیتا ہے اور ساتھ ہی وہ اس پر گزری ہوئی قلبی واردات کے آثار کو پہچان لیتا ہے۔

بعض اوقات کرشن چندر فطرت اور کرداروں کے روحانی ملاپ کے ذریعے ماحول کے نشیب وفراز میں ایک خاص تاثر پیدا کرتے ہیں۔ وہ ''پورے چاند کی رات'' میں ایک جگہ کہتے ہیں:

> کشتی خوبانی کے ایک پیڑ سے بندھی تھی۔ جو بالکل جھیل کے کنارے اگا تھا۔ یہاں پر زمین بہت نرم تھی اور چاندنی پتوں کی اوٹ سے چھنتی ہوئی آ رہی تھی اور مینڈک ہولے ہولے گا رہے تھے اور جھیل کا پانی بار بار کنارے کو چومتا جاتا تھا اور اس کے چومنے کی صدا بار بار ہمارے کانوں میں آ رہی تھی۔ میں نے دونوں ہاتھ، اس کی کمر میں ڈال دیئے اور اسے زور سے اپنے سینے سے لگا لیا۔ جھیل کا پانی بار بار کنارے کو چوم رہا تھا۔ پہلے میں نے اس کی آنکھیں چومیں اور جھیل کی سطح پر لاکھوں کنول کھل گئے۔ پھر میں نے اس کے رخسار چومے اور نرم ہواؤں کے لطیف جھونکے یکا یک بلند ہو کے صدہا گیت گانے لگے۔ پھر میں نے اس کے ہونٹ چومے اور لاکھوں مندروں، مسجدوں اور کلیساؤں میں دعاؤں کا شور بلند ہوا اور زمین کے پھول اور آسمان کے تارے اور ہواؤں میں اڑانے والے بادل سب مل کے ناچنے لگے۔ پھر میں نے اس کی ٹھوڑی کو چوما اور پھر اس کی گردن کے پیچ وخم کو۔ اور کنول کھلتے کھلتے سمٹتے گئے کلیوں کی طرح۔ اور گیت بلند ہو ہو کے مدھم ہوتے گئے اور ناچ دھیما پڑ تا پڑتا رک گیا۔ اب وہی مینڈک کی آواز تھی۔ وہی جھیل کے نرم نرم بوسے اور کوئی چھاتی سے لگا سسکیاں لے رہا تھا۔

عاشق اور معشوقۂ بے نیاز فطرت کے آغوش میں سرمست خواب رہتے ہیں اور قدرت انھیں اپنے بوقلموں حسن و جمال کے جلوے دکھا رہی ہے۔ چاند کی دلنواز روشنی ان خواب ناک مناظر کے لیے مشاطہ کا کام دے رہی ہے اور ساتھ ہی دونوں کے دلوں میں مزید اشتیاق وانکشاف کا جذبہ بھڑکا رہی ہے۔ اس طلسمی ماحول سے متاثر ہو کر اب دونوں کی تھرتھراتی ہوئی روحیں فضا میں پگھل کر اپنی ازلی صورت میں لوٹتے ہوئے نظر آتی ہیں۔ کرشن چندر کی فضا بندی اور منظر کشی کے مطالعے سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے لیے خارجیت کے اظہار کا مقصد محض مادی حالات کی نقاشی تک محدود نہیں رہتا بلکہ وہ اپنے انداز بیان کے ذریعے قارئین کے احساس وشعور کو روحانی سطح پر اٹھا کر قدرت کی حقیقت و رمزیت سے انھیں آشنا کرتے ہیں۔

لیکن یہاں ہمیں اس بات پر غور کرنا چاہئے کہ دراصل کسی شے کے وجود کا احساس ہر انسان کے اندرونی شعوروں پر مبنی ہے۔ انسان اپنے عقلی وشعوری پس منظروں کے عینک میں ہر شے کی اصلیت کو دیکھتا ہے۔ چنانچہ مختلف انسانوں کی نظروں میں ایک وجود کا تاثر مختلف کیفیتوں میں نمود ہوتا ہے۔ کرشن چندر ایک حقیقت پسند فن کار کی حیثیت سے اندرونی و بیرونی دونوں کیفیتوں کو تاثراتی رنگوں کے ساتھ قلم بند کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے ان کے فن میں ان کے ہم عصر افسانہ نگاروں، یعنی منٹو، بیدی اور عصمت چغتائی سے بھی زیادہ حقیقت کا رنگ شوخ دکھائی دیتا ہے۔

موضوعات کا تنوع

کرشن چندر کے افسانوں کو پڑھ کر قارئین کو یقیناً اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ وہ فطرت اور انسان کو الگ الگ خانوں میں رکھ کر تقسیم نہیں کر تے ہیں بلکہ انہیں اندرونی ربط وضبط کے ساتھ ایک مجموعی وجود کے روپ میں دیکھتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں فطرت اور انسان کے باطنی رشتوں کے متعلق ان کی عقیدت وخیالات کا سراغ جگہ جگہ ملتا ہے۔ ''پورے چاند کی رات'' میں کرشن چندر نے رومانی فضاؤں کی نقاشی اور تڑپتی ہوئی دو روحوں کی داستان کے ذریعے فطرت کی رمزیت اور ابدیت کی طرف نشاندہی کی ہے۔:

> ہم دونوں چپ ہو گئے۔ بچے کھیلتے کھیلتے ہمارے پاس واپس آ گئے۔ اس نے میری پوتی کو اٹھالیا، میں نے اس کے پوتے کو، اس نے میری پوتی کو چوما، میں نے اس کے پوتے کو، اور ہم دونوں خوشی سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ اس کی پتلیوں میں چاند چمک رہا تھا اور وہ چاند حیرت سے اور مسرت سے کہہ رہا تھا: ''انسان مرجاتے ہیں، لیکن زندگی نہیں مرتی۔ بہار ختم ہوجاتی ہے، لیکن پھر دوسری بہار آ جاتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی محبتیں بھی ختم ہوجاتی ہیں۔ لیکن زندگی کی بڑی اور عظیم سچی محبت ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ تم دونوں پچھلی بہار میں نہ تھے۔ یہ بہار تم نے دیکھی، اس سے اگلی بہار میں تم نہ ہو گے۔ لیکن زندگی بھی ہوگی اور محبت بھی ہوگی اور خوبصورتی اور رعنائی اور معصومیت بھی۔'' بچے ہماری گود سے اتر پڑے کیونکہ وہ الگ سے کھیلنا چاہتے تھے۔ وہ بھاگتے ہوئے خوبانی کے درخت کے قریب چلے گئے، جہاں کشتی بندھی تھی۔ میں نے پوچھا: ''یہ وہی درخت ہے''۔ اس نے مسکرا کر کہا: ''نہیں یہ دوسرا درخت ہے''۔

''آدھے گھنٹے کا خدا'' میں ایک سپاہی، اپنے دشمنوں کے ہاتھوں موت کا شکار ہونے والا ہے۔ اس کے اندر اپنی جان کے تحفظ کا جو احساس تھا وہ اسی وقت یکسر فنا ہو جاتا ہے اور ساتھ ہی اس کا شعور قدرت کے اجتماعی وجود میں ضم ہو جاتا ہے۔ اب اسے ہر قسم کے سماجی و معاشرتی شعوروں سے مکمل طور پر آزاد ہو کر نئی زندگی کے آغاز کا احساس ہوتا ہے۔:

> پھر ابتدا سے وہ جو پلٹا تو اگلے چند لمحوں میں اپنی پوری زندگی پھلانگ گیا۔ اور یکا یک اسے محسوس ہوا کہ اب تک اس نے جتنی زندگی گزاری وہ دوسروں کے لئے تھی۔ موگری کی پہلی وفا کے لئے۔ اور اس کی آخری بے وفائی کے لئے۔ اپنے ملک کی محبت کے لئے اور اس کے آخری انتقام کے لئے اور آخر میں اس خندق کے لئے جو دلوں کو دلوں سے جدا کرتی ہے۔ قطرہ قطرہ کر کے جب اس نے اپنی زندگی کا سارا حساب چکا دیا تو اسے محسوس ہوا کہ اس کے پاس صرف یہی آدھ گھنٹہ بچا ہے جو مکمل طور پر اس کا

اپنا تھا۔

مگر آدھ گھنٹہ تو بہت ہوتا ہے۔ وہ تو ایک طویل عرصہ ہوتا ہے۔اس عرصے میں وہ بہت کچھ کر سکتا ہے۔ وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر آسمان سے گلے مل سکتا ہے۔زمین پر کھلے ہوئے بسنتی پھولوں کو سونگھ سکتا ہے۔ہوا میں اڑتی ہوئی نازک بدن ابابیل اور زمین پر چلتی ہوئی کنواری ندی کو دیکھ سکتا ہے۔اس آدھے گھنٹے میں وہ ایک پوری زندگی گزار سکتا ہے۔آدھ گھنٹہ تو بہت ہوتا ہے.....!

اور جب اس نے یوں محسوس کیا تو ایسا لگا جیسے وہ ابھی ابھی پیدا ہوا ہے۔

یکا یک اس کے سارے جسم سے درد نکل گیا۔اس نے اپنے آپ کو بالکل ایک نوزائیدہ بچے کی طرح ہلکا پھلکا اور معصوم محسوس کیا۔ یکا یک اس کا جی چاہا کہ وہ باہیں پھیلا کر زور سے قہقہہ لگائے۔ایسا خوش نصیب آدھ گھنٹہ کس کی زندگی میں آیا ہوگا۔شروع سے آخر تک اس کا اپنا اس کے آغاز سے انجام تک مکمل باخبر۔اس آدھ گھنٹہ میں وہ اپنی تقدیر پر پوری طرح قادر تھا۔ وہ اس آدھے گھنٹے کا خدا تھا۔

دراصل کرشن چندر کی فطرت پرستی (Nature Worship) ہر چیز کو ظاہری طور پر الگ الگ اور باطنی طور پر ایک ہی صورت میں دیکھتی ہے۔ چنانچہ اس عقیدت کے تحت قدرت اور انسان کے روحانی تعلقات کو تاثراتی پیرایوں کے ذریعے نمایاں کر کے اس کی مجموعیت کو ثابت کرنے کی سعی کرنا کرشن چندر کے لیے بالکل لازمی عمل تھا۔

کرشن چندر کا خیال ہے کہ اس اجتماعی شعور کے سبب ایک انسان کی تکلیف بیک وقت باقی تمام انسانوں کی تکلیف بھی ہو سکتی ہے۔لیکن سماج کی فرسودہ و بوسیدہ اقدار اور سرمایہ دارانہ نظام کے اثرات سے زمانے نے اپنی اصلیت کو فراموش کر دیا اور وہ خود ناانصافیوں اور ناہمواریوں کا شکار ہو کر بے شمار طبقوں میں منقسم ہو چکا ہے۔اس معاشرتی و اقتصادی نظام میں ایک طرف امراجو سرمایہ دارانہ نظام کے پروردہ ہیں،غریبوں کا خون چوس کر دولت و ثروت کے نشے میں مخمور ہو رہے ہیں۔دوسری طرف غربا استحصالِ محض ہیں۔ وہ انسانیت اور محبت و اخوت کے سبقوں سے محروم ہو کر امرا و شرفا کی خدمات کے لیے غلامانہ زندگی گزارنے پر مجبور رہتے ہیں۔نیز وہ بعض اوقات نامساعد حالات کے باعث روٹی کا ایک ٹکڑا حاصل کرنے کے لیے اپنی عزت و آبرو کو فروخت کر دیتے ہیں۔کرشن چندر سماج کے ان دو طبقوں کی آپسی کشمکش کی وضاحت کے لیے عام طور پر انسان کی دو متضاد خصلتیں، یعنی تہذیبی وحشیانہ پن اور خلقی معصومیت کی کشیدگی پر روشنی ڈالتے ہیں اور اکثر و بیشتر وہ اپنے تخیل کو پرواز دیتے ہوئے ان دو خصلتوں کو مرد اور عورت کے دو روپوں میں مجسم کر کے کشمیر کی خوبصورت وادیوں میں انھیں ملا دیتے ہیں۔ چنانچہ ان کی اکثر کہانیوں میں مرد و زن دونوں علامتی مفہوموں کے حامل ہیں۔ یہاں مرد تہذیب کا پتلا ہے اور عورت فطری اوصاف کا پیکر۔دراصل انسان جھوٹی شرافت کی آڑ میں اپنا پنجہ چھپائے ہوئے معصوموں کا شکار کرتا رہتا ہے۔اگرچہ ان افسانوں میں بیشتر اوقات مرد خود معصومیت کو حقارت کی نگاہ سے نہیں دیکھنا چاہتا۔لیکن اس کے ہمدردانہ رویوں میں ضرور اپنی برتری کا احساس مرتب رہتا ہے۔اس لیے اس کے نفس میں ایک طرح کے ذہنی تناؤ اور اضطرابی کیفیت بھی چھپی ہوئی ہے۔کبھی یہ ذہنی کشمکش مرکزی کردار کو معصومیت کا حامی بنا سکتی ہے اور کبھی تہذیب کا مفتوح۔ چونکہ کہانی بظاہر تہذیب اور فطرت کی جنگ ہونے کے باوجود اصل میں مرکزی کردار کے نقطۂ نظر پر مبنی ہے۔اس لیے فطرت عارضی طور پر ہی اس جنگ میں فتح پا سکتی ہے۔کرشن چندر نے ''گرجن کی ایک شام''، ''آنگی''، ''آنسوؤں والی'' اور ''بند والی'' میں ان دو خصلتوں کے باہمی تصادم کو فن کارانہ کمالات کے ساتھ دکھایا ہے۔

کرشن چندر کے افسانوں میں محبت، انسان کی ایک اہم ترین صفت کے طور پر نمودار ہوتی ہے کیونکہ یہ وہی جذبہ ہے جو ہر کس و ناکس کے دل کے ساگر میں ازل سے موجزن رہتی ہے۔انسان جب دنیا میں پیدا ہوا اس وقت سے اب تک یہی جذبہ قوت مقناطیس کی طرح انھیں آپس میں ملا کر مدغم کرتا رہتا ہے۔کرشن چندر اس فطری وصف کی مدد سے دنیا کے مظالم کو ختم ہوتے ہوئے دیکھنا چاہتے ہیں۔اگرچہ تہذیب نے انسان کی اس خصلت میں

تصنع کا رنگ ملا کراسے آلودہ کر دیا ہے۔لیکن کرشن چندر قارئین کے دلوں کواس جذبے سے از سرِنو معمور کرنے اور انھیں اپنی ازلی کیفیت سے ہمکنار کر کے لیے اپنی کہانیوں میں قدرت کی مرصع کاری اور عورتوں کی رعنائیوں اور خوشنمائیوں کی نمائش سے خوب کام لیتے ہیں۔لیکن پھر بھی وہ آدمی کی اس خوا بیدہ فطرت کو بیدار کرنے کے لیے مطلق مذہب کا سہارا نہیں لیتے ،کیونکہ مذہب نے عقائد کے ظاہری اختلافات کے باعث سماج کو نہایت بے رحمانہ اور سفاکانہ طریقوں سے تقسیم کر کے انسانی فطرت کو کچل ڈالا ہے۔چنانچہ وہ موجودہ سماجی اقدار کے مانند مذہبی عقائد کو بھی بے معنی اور مہمل خیال کر تے ہیں۔''پشاور ا کسپریس'' میں وہ مذہبی اقدار واحساسات کی کہنگی اور فرسودگی پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انسان اپنی شہوت اور حیوانیت کی تشنگی کو بجھا نے کے لیے غیروں کی جان،عزت وآبرو اور مال ومتاع سے کھیلتے رہتے ہیں۔نتیجتاً دنیا میں ہرجگہ نفرت،بغض اور عداوت کی آتشیں دائرے کی صورت میں چاروں طرف پھیلتی رہتی ہیں۔اب مذہب آدمی کے کیے اپنی وحشیانہ وظالمانہ خواہشات کو تکمیل تک پہنچانے کا محض بہانہ بن چکا ہے۔اس طرح وہ اپنے اولین افسانے''پرانے خدا'' میں مذہبی پیشواؤں کے سرمایہ دارانہ طریقۂ کار کے متعلق یوں اظہار خیال کرتے ہیں۔:

> برندابن کے ایک مندر میں میں نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا ہال ہے جنھیں سات آٹھ سو سادھو ہاتھ میں کھڑتالیں لئے ایک ساتھ گا رہے ہیں۔رادھے شیام،رادھے شیام.....لفٹ رائیٹ،لفٹ رائیٹ...... باقاعدگی تنظیم،اندھا پن ،تہذیب اور طاقت کے ہزاروں راز اس رقت انگیز نظارے میں مستور تھے۔ہر روز سینکڑوں بلکہ ہزاروں جاتری اس مندر میں آتے تھے اور بے شمار چڑھاوا چڑھتا تھا۔سنا ہے کہ ان اندھے سادھوؤں کو صبح شام دونوں وقت کھانا مل جاتا تھا اور ایک پیسہ دکشنا کا،باقی جو منافع ہوتا وہ ایک گیم وشیم پانڈے کی تجوری میں چلا جاتا،ایک اور مندر میں بھی میں نے ایسا ہی نظارہ دیکھا ،فرق یہ تھا کہ یہاں اندھے سادھوؤں کے بجائے بے کس اور نادار عورتیں کرشن بھگوان کی اُستتی کر رہی تھیں۔دن بھر اُستتی کر نے کے بعد انہیں بھی وہی راشن ملتا تھا جو اندھے سادھوؤں کے حصے میں آتا تھا۔یعنی دو وقت کا کھانا اور ایک پیسہ دکشنا کا۔

بے کس اور نادار انسانوں کے ذریعہ مذہب کے ٹھیکے دار،خدا کے نام پر نہایت جدید تنظیم کے ساتھ دنیاوی فوائد حاصل کرنے میں کوشاں رہتے ہیں جیسے سرمایہ دار اپنی فیکٹری میں غریب مزدوروں کا استحصال کر رہے ہوں۔چنانچہ کرشن چندر اس معاشرتی واقتصادی جبر وتشدد اور مذہبی تفریق واختلاف کو دنیا سے مٹانے اور تمام انسانوں کو محبت واخوت کی تعلیمات سے بہرہ ور کرنے کے لیے ایک زبردست تحریک،یعنی اشتراکیت کو ایک کارگر وسیلہ خیال کرتے ہیں۔دراصل کرشن چندر اشتراکی ہونے کی وجہ سے قدرت اور انسانوں کے اجتماعی تصور کے قائل نہیں ہیں بلکہ اس اجتماعی خیال کا عقیدہ رکھنے کے سبب اشتراکیت کو حصولِ مدعا کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔یعنی پہلے وہ فطرت کی باطنی اجتماعیت اور اصلیت کو تسلیم کرتے ہیں اور اس کے بعد تمام انسانوں کو ظاہری طور پر ایک سیاسی نقطۂ نظر کے جھنڈے تلے متحد ہوتے ہوئے دیکھنا چاہتے ہیں۔

لیکن یہاں میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ کبھی کبھی وہ دنیا کے سنگلاخ ہنگاموں،ظلم وتشدد اور غریبوں کی بے کسی وبے بسی سے بدرجہا زیادہ متاثر ہونے کے باعث جذبات کی رو میں بہہ کر اپنی اصلی منزل سے پرے چھلانگ لگا دیتے ہیں۔اکثر یہی فنکارانہ نقص ان کی کردار نگاری میں نمایاں ہوتا ہے۔مثلاً''زندگی کے موڑ پر''اور''حسن اور حیوان'' میں ہر واقعے کے خلاف کرداروں کے نفسیاتی ردعمل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ان افسانوں میں مرکزی کردار ہر ماحول،ہر واقعے اور ہر شخص کو اپنے سیاسی نظریات کے زاویے کے ساتھ پرکھنے اور جانچنے کی کوشش کرتے ہیں۔اسی طرح کا ناقدانہ کردار یقیناً ادب کے جمالیاتی پہلوؤں کو مجروح کر دیتا ہے،

کیوں کہ اس کے مبلغانہ رویوں سے افسانے کے پورے ماحول پر کردار کے جذبات کا منفی عنصر حاوی ہوسکتا ہے۔

کردار نگاری اور نفسیاتی تجزیہ

کردارنگاری میں سب سے اہم عنصر کرداروں کی عمومیت اور خصوصیت دونوں کا اعتدال وتوازن ہے۔ کردار اپنی عمومیت کی وجہ سے کہانی کی دنیا میں حقیقی زندگی کا رنگ بھر سکتا ہے۔ مگر وہ اس کے ساتھ اپنی خصوصیت کے باعث افسانے کی سپاٹ دنیا میں وقتی طور پر فائق اور سر بلند ہوسکتا ہے۔ نتیجتاً اسے ان دونوں عناصر کے معتدل ومتوازن اخلاط اور تطابق سے قارئین کی نظروں میں مقبولیت کا رتبہ حاصل ہوسکتا ہے۔ کرشن چندر کے افسانوں میں بھی ان دوعناصر کے مناسب اور موافق امتزاج ملتی ہے۔ عموماً ان کا مرکزی کردار نفسیاتی اعتبار سے مغرب کے صنعتی نظام کا پیداوار ہے۔ مگر وہ فطرت کے آغوش میں رہ کر حسن کمال کے مجسمے کی محبت میں گرفتار ہوجاتا ہے۔ اس کے عشق کے جذبے میں کسی قدر شہوت، تصنع اور فریب کے احساسات مضمر ہیں۔ مگر تہذیبی مکاری وعیاری اور فطرت کی معصومیت دونوں کے تضاد کو دیکھ کر اسے اس پاکیزہ اور مقدس ماحول میں اپنی اجنبیت کا احساس ہوتا ہے۔ اسی طرح کرشن چندر کے ہاں ہیرو کے ارتقائی مراحل میں نفس کی وارفتگی اور انکشاف دونوں عناصر اہمیت رکھتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس ان کی ہیروئن بڑی حد تک ذہنی پراگندگیوں اور داخلی ارتقاؤں سے بالاتر نظر آتی ہے۔ نیز اس کی شخصیت نگاری اور سراپا نگاری ہمیشہ ادب کے روایتی انداز پر دار ومدار رہتی ہے۔ چنانچہ وہ حسن وجوبن کا مرقع ہونے کے باوجود تخلیق کار کی جزئیات نگاری اور تفصیل گوئی سے یکسر عاری رہتی ہے۔ ''گرجن کی ایک شام''، ''ٹوٹے ہوئے تارے''، ''بندوالی'' اور ''آنسوؤں والی'' میں ہمیں کرشن چندر کے ان ٹائپ کیریکٹروں کے نمونے ملتے ہیں۔ ''گرجن کی ایک شام'' میں جگدیش اپنی معشوقہ اور کشمیر کے حسنِ قدرت سے متاثر ہوکر اپنے معاشرتی قدروں اور شعوروں سے ذہنی طور پر آزاد ہوجاتا ہے۔ افسانہ نگار نے مرکزی کردار (کہانی گوکردار) کو جگدیش کے متضاد کردار کی حیثیت سے پیش کر کے اس کے مکارانہ طریق کار کو عریاں کیا ہے۔ اس لئے کرشن چندر جگدیش کی مثالیت کو آخر تک قائم کرنے کے لیے پہاڑی قبیلوں کی روایت کے مطابق انجام میں اسے موت سے ہمکنار کردیتے ہیں۔ کرشن چندر نے بچپن میں بچوں کی نفسیاتی اتار چڑھاؤ کو فنکارانہ مہارت کے ساتھ دکھایا ہے۔ اس میں بچے کے پیار کا جذبہ کہانی کا مرکزی نقطہ ہے۔ چونکہ بچوں کے جذبات مستقل طور پر قائم نہیں رہتے، اس لئے اس کی محبت کا شعور بھی ٹھوس بنیاد پر نہیں رہتا اور مرکزی کردار کی آنکھوں کے سامنے جو آئے وہ اُس سے متاثر ہوکر وقتی طور پر اپنے پیار کے احساس کو فراموش کردیتا ہے۔

مشترکہ قدروں کی اجتماعی وعملی تشکیل کو سماج کہتے ہیں۔ اس لیے سماج کا سب سے اولین مطمعِ نظر ان قدروں کا تحفظ، یعنی اپنے افراد کی ذہنیت کی روایتی نشوونما ہے۔ واضح رہے کہ انسان کے اقوال واعمال میں اپنے معاشرے کے اجتماعی شعوروں کے اثرات صریحاً مرتب ہوتے ہیں کیونکہ قدروں کا مجازی سایہ ہمیشہ اصل کی ذہنیت کے گرد وپیش چسپاں رہتا ہے۔ اردو ادب کی تاریخ میں پریم چند نے پہلی بار سماج اور انسان کے حقیقی رشتوں پر روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے اپنی افسانہ نگاری کے ابتدائی اور درمیانی زمانوں میں آدمی کو ذاتی شعوروں اور معاشرے کی مشترکہ قدروں کے درمیان آویزاں ہوتے ہوئے دکھایا ہے اور انھوں نے اپنی کہانیوں کے ذریعے درپردہ انفرادی وجود کو سماج کے مجموعی احساسات کے ساتھ سمجھوتا کرنے اور اس میں ضم ہونے کی تلقین کی ہے۔ مگر ان کے آخری ایام کی تخلیقات میں بعض کردار معاشرے کے مروجہ اصول وضوابط سے بے نیاز اور بالاتر نظر آتے ہیں، کیونکہ پریم چند نے اس دور میں سماج اور مذہب کے بے جا قوانین اور غلط رسم ورواج کے خلاف آواز بلند کر کے انفرادیت پسندی (Individualism) کو انسان کا اہم ترین حق خیال کرنے لگے تھے۔ کرشن چندر نے بھی پریم چند کے مانند سماجی انسان کے تصور کو اپنے افسانوں کا موضوعِ خاص بنایا ہے۔ لیکن انھوں نے بعض کہانیوں میں بجائے انسان اور معاشرے کے ظاہری تعلقات کے نفسیاتی ردِعمل کے آئینے میں اس معمے کو حل کرنے کی سعی کی ہے۔ ان میں کرشن چندر نے معاشرتی واقتصادی جبر وتشدد کے تحت انسان کو نفسیاتی طور پر حقیقی دنیا کی متلاطم کیفیتوں سے مفر کی راہ اختیار کرتے ہوئے دکھایا ہے۔

''کالو بھنگی'' میں انھوں نے ایک ایسی شخصیت کی تخلیق کی ہے جو حقیقی دنیا میں زندگی گزارنے کے باوجود اپنی داخلی دنیا میں ہوائی گرہ لگا کر اپنے خواب کی تعبیر نکالتا ہے۔ کالو بھنگی کی تمام عمر امراء اور مریضوں کی خدمات کے لئے وقف کردی گئی ہے۔ ان خدمات کے بدلے میں اسے ادنیٰ سے ادنیٰ صلے اپنے مالک کی طرف سے میسر ہوتے ہیں اور وہ اپنی چھوٹی سی خواہشات کو پورا کرنے سے بھی قاصر رہتا ہے۔ اسپتال کا کمپاؤنڈر خلجی اپنی

مریضاؤں کے ساتھ کھلم کھلا عشق لڑاتا ہے، جبکہ کالو بھنگی کے لیے جذبات کا آزادانہ اظہار بھی ممنوع ہے کیونکہ اس کے جذبات بھی باقی تمام باتوں کے مانند سماجی و مذہبی اقدار کی سخت پابندیوں کے شکنجے میں جکڑے ہوئے ہیں۔:

''عشق کرنے کے لئے جی چاہتا ہے تمہارا؟ شاید کسی سے محبت کی ہوگی تم نے، جبھی تم نے اب تک شادی نہیں کی''
''عشق کیا ہوتا ہے۔ چھوٹے صاحب؟''
''عورت سے عشق کرتے ہیں لوگ''
''عشق کیسے کرتے ہیں صاحب؟ شادی تو ضرور کرتے ہیں سب لوگ، بڑے لوگ عشق بھی کرتے ہوں گے چھوٹے صاحب۔ مگر ہم نے نہیں سنا وہ جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں۔ رہی شادی کی بات، وہ میں نے آپ کو بتا دی۔ شادی کیوں نہیں کی میں نے، کیسے ہوتی شادی میری، آپ بتایئے؟...'' (ہم کیا بتائیں خاک)
''تمہیں افسوس نہیں ہے کالو بھنگی؟''
''کس بات کا افسوس؟ چھوٹے صاحب''
میں نے ہار کر اس کے متعلق لکھنے کا خیال چھوڑ دیا۔

یہاں تک پڑھ کر ہمیں یہ گمان ہوتا ہے کہ زمانے نے مسلسل استحصال کے ذریعے اس کی تمام انسانی حسیت کو تحس نحس کر کے اسے مکمل طور پر اپنی کٹھ پتلی بنا ڈالی ہے۔ لیکن فن کار، کالو بھنگی کے نفسیاتی عقدے کو کھولتے ہوئے آگے لکھتے ہیں:

جب تو گائے سے اپنا سر چٹوا تا ہے مجھے معلوم ہے تو اپنے تخیل میں اپنی بیوی کو دیکھتا ہے جو تیرے بالوں میں اپنی انگلیاں پھیر کر تیرا سر سہلا رہی ہے ۔حتیٰ کہ تیری آنکھیں بند ہو جاتی ہیں تیرا سر جھک جاتا ہے اور تو اس کی مہربان آغوش میں سو جاتا ہے اور جب تو آہستہ آہستہ آگ پر میرے لئے مکئی کا بھٹا سینکتا ہے اور مجھے جس شفقت اور محبت سے وہ بھٹا کھلاتا ہے تو اپنے ذہن کی پنہائی میں اس ننھے بچے کو دیکھ رہا ہوتا ہے جو تیرا بیٹا نہیں ہے جو ابھی نہیں آیا۔ جو تیری زندگی میں کبھی نہیں آئے گا۔ لیکن جس سے تو نے ایک شفیق باپ کی طرح پیار کیا ہے تو نے اسے گودیوں میں کھلایا ہے، اس کا منہ چوما ہے اسے اپنے کندھے پر بٹھا کر ، جہان بھر میں گھمایا ہے۔ دیکھ لو، یہ ہے میرا بیٹا، یہ ہے میرا بیٹا۔

معلوم ہوتا ہے کہ وہ خارجی دنیا کے ظلم و تحکم کے ردِعمل میں اپنی اندرونی کائنات میں روحانی نجات کی راہ ڈھونڈ رہا ہے ۔ اس سین (scene) میں وہ انتہائی غربت وافلاس اور مظلومیت کی بدولت خیالی دنیا میں غرق ہو کر اپنی تمنائیں پوری کرتے ہوئے نظر آتا ہے۔
''شہزادہ'' میں سدھا کا نفسیاتی پہلو، کالو بھنگی سے مشابہت رکھتا ہے۔ سماج میں عورت ہمیشہ کسی نہ کسی صورت میں معاشرتی و اقتصادی استحصال کا شکار رہتی ہے۔ خصوصاً شادی بیاہ کے معاملے میں لوگ اس کی سماجی کمزوریوں سے خوب ناجائز فائدہ اٹھانے کے لیے اس کے ساتھ بازار کے مال و اسباب کی طرح سلوک کیا کرتے ہیں۔ ''شہزادہ'' میں لوگ سدھا کی ظاہری شکل وصورت اور اس کے ماں باپ کی معاشی حالت پر نظر ڈال کر اس کے باطنی محاسن کو سمجھنے کی ذرہ برابر کوشش نہیں کرتے ہیں۔ نتیجتاً سدھا بھی کالو بھنگی کی طرح داخلی دنیا کا باشندہ بن کر اپنے خیالی عاشق کے ساتھ زندگی گزارنے لگتی ہے۔:

اب وہ خوش حال اور آرام دہ اور سکون آمیز زندگی بسر کر رہی تھی۔ کئی سال سے وہ اپنی مانگ میں سیندور بھر رہی تھی اور ماتھے پر

سہاگ کی بندیا سجاتی تھی۔ اور لوگوں کو یہ تو معلوم نہ تھا کہ اس کی شادی کہاں ہوئی ہے؟ اور کون اس کا خاوند ہے؟ مگر لوگ اتنا جانتے تھے کوئی اس کا ہے، جس کے ساتھ وہ اپنی شامیں گزارتی تھی۔ بلکہ لوگ تو یہاں تک کہتے سنے گئے کہ جو کوئی بھی وہ ہے، اس کی اپنی کچھ وجوہ ہیں، جن کی وجہ سے ان دونوں کی شادی نہیں ہوئی۔ مگر وہ دونوں ہر شام کی تنہائیوں میں ملتے ہیں اور جب دنیا سو جاتی ہے اور جب کوئی کسی کو نہیں دیکھتا۔ جب چاروں طرف نیند غالب آجاتی ہے۔ ان غنودگی سے لبریز لمحوں میں کوئی سدھا کے یہاں آتا ہے، ہولے سے دروازہ کھٹکھٹاتا ہے اور خاموشی سے اندر آجاتا ہے......لوگوں نے اسے دیکھا نہیں تھا۔ مگر لوگوں کا خیال یہی تھا۔ وہ سدھا سے کچھ کہتے نہیں تھے۔ کیوں کہ سدھا اب ایک سنجیدہ اور باوقار عورت بن چکی تھی اور جس کے ماتھے پر سیندور کا یہ بڑا ٹیکا جگمگاتا ہو، اسے کوئی کیا کہہ سکتا ہے؟

مگر سدھا کا کردار کالو بھنگی سے کسی قدر مختلف ہے۔ اپنے خیالی عاشق موتی کی صحبت کے باعث اس کے اندر اصلی زندگی میں بھی خود اعتمادی کا جذبہ اور ترقی کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ دراصل تخیلات کی فراوانی اور دروں بینی کی تیزی کی بدولت سدھا اپنے ہوائی قلعے کو حقیقی دنیا میں بھی محسوس کرنے لگتی ہے اور اس کے اثرات خارجی طور پر ہولے ہولے سدھا کی ذات میں نمایاں ہونے لگتے ہیں، جبکہ کالو بھنگی شعوری طور پر حقیقی و خیالی دونوں کائناتوں کو الگ الگ نظروں کے ساتھ دیکھتا ہے، کیونکہ اپنی شکست خوردگی اور طبقاتی احساس کی شدت کی وجہ سے اب اس کے اندر تغیراتِ زندگی کی کوئی امید باقی نہیں رہی ہے۔ یقیناً دروں بینی کی کثرت سدھا کی عملی زندگی میں ایک ایندھن کا کام کر دیتی ہے۔ مگر اس پر اپنے تمام تر وجود کو منحصر کرنے کے سبب انجام میں اصلیت کا سامنا کرنے سے اس کا ذہنی توازن یکسر پارہ پارہ ہو جاتا ہے۔

مگر ان دو کرداروں کے برعکس ''تائی ایسری'' میں تائی کو خیالی صحرا نوردی کے بجائے اصلی زندگی کے ناموافق حالات سے لڑتے ہوئے اور دوسروں کی خدمات میں مصروفِ عمل ہوتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ تائی اپنی سوسائٹی کے مروجہ رسم و رواج اور رہن سہن کے مطابق زندگی گزارتی ہے۔ لیکن اس کی انسان دوستی اور رحم دلی کا شعور کسی قسم کی معاشرتی و مذہبی بندشوں میں مقید نہیں رہتا۔ وہ وقت پڑنے پر ان فرسودہ اور بوسیدہ قدروں سے متصادم ہو کر ہر طرح کے انسان سے بلا تعصب خوش سلوکی کے ساتھ پیش آتی ہے اور اس کے ہر مسئلہ کو سلجھانے میں حتی الامکان کوشاں رہتی ہے۔ مگر اس ظاہری حیات کے پردے کے پیچھے وہ اپنی ازدواجی زندگی میں شوہر کی آوارہ گردی اور اس کے ساتھ ناچاقی کے باعث شکست و ریخت کا شکار ہو چکی ہے۔ چنانچہ افسانہ نگار نے تائی کی نفسیاتی کشمکش کو وقتاً فوقتاً ظاہری روپ میں نمودار ہوتے ہوئے دکھایا ہے۔:

> وہ ہم سب کو بچوں کی طرح سمجھاتے ہوئے بولیں: ''دیکھو، میرا خیال یہ ہے کہ یہ لمبا صوفہ تو اس لئے بنا ہے کہ جب دونوں میاں بیوی میں صلح ہو تو وہ دونوں اس لمبے صوفے پر بیٹھیں اور جب ان دونوں میں لڑائی ہو تو الگ الگ ان دو چھوٹے چھوٹے صوفوں پر بیٹھیں۔ سچ مچ یہ انگریز بڑے عقل مند ہوتے ہیں جبھی تو ہم پر حکومت کرتے ہیں۔''
>
> تائی کی دلیل سن کر محفل میں ایک زوردار قہقہہ پڑا۔ مگر میں نے دیکھا کہ تائی یہ سوچ کر اور بات کہہ کر چپ سی ہو گئیں۔ کیا اس وقت انہیں اپنا اور اپنے خاوند کا جھگڑا یاد آیا تھا۔ یہ تو میں نہیں کہہ سکتا۔
>
> میں نے جب غور سے ان کی آنکھوں میں دیکھا تو ایک پل کے لئے مجھے ان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک نظر آئی۔ پھر مجھے ایسا محسوس ہوا، جیسے دریا کا پاٹ بہت چوڑا ہو گیا ہو۔

دراصل تائی ایسری کا کردار، کالو بھنگی اور سدھا کا متضاد ہے۔ ایک طرف یہ دونوں کرداروں نے زندگی کی مشکلات کو سلجھانے میں ناکام ہو کر روحانی دنیا میں مفر کی راہ اختیار کر لی ہے۔ دوسری طرف گھریلو زندگی کی محرومیت اور شکست خوردگی کے احساس نے تائی کو اجتماعی زندگی میں نیا رول ادا کر

نے پر مجبور کر دیا ہے۔لیکن اس جذبے کی منتقلی میں ضرور اس کی خلقی بیروں بینی کا ہاتھ بھی ہے، نہ کہ دروں بینی کا۔

ٹیکنیک

مذکورہ بالا عبارتوں میں اسالیب، موضوعات اور کردار نگاری کے پیشِ نظر اختصار کے ساتھ کرشن چندر کے افسانوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ چنانچہ ان تجزیوں کے ساتھ ٹیکنیکی اعتبار سے ان کے فن پر روشنی ڈالنا ان کی افسانہ نگاری کو سمجھنے کے لیے مفید ہوسکتا ہے۔''مہالکشمی کا پل'' میں مصنف پل کو کہانی کا مرکز بنا کر اس کے گردوپیش کے ماحول کی طرف کہانی کے اسٹیج کو رفتہ رفتہ پھیلا دیتے ہیں۔مصنف مہالکشمی کے پل پر لہراتی ہوئی ساڑھیوں کے تاثرات میں نئے نئے موضوعات کو ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ کہانی در اصل مرکزی کردار کے شعور کی رو (Stream of Consciousness) کے ذریعے تعمیر ہوئی ہے اور ان متحرک بیانات کی وجہ سے قارئین کو کہانی کی دنیا میں غیر محدود اور بے کراں وسعت کا احساس ہوتا ہے۔کرشن چندر نے ''بالکونی'' میں بھی اسی ٹیکنیک سے کام لیا ہے۔مگر ''بالکونی'' کے مقابلے میں اس میں کسی قدر فن کار کی داخلیت کا عنصر زیادہ پایا جاتا ہے۔

''غالیچہ'' کا اندازِ بیان بھی ایک حد تک ان دو افسانوں سے مماثل ہے۔اس میں ہیرو کے جذبات واحساسات ایک غالیچے کے تاثر میں یکجا رہتے ہیں۔در اصل ہیرو کے لئے یہ غالیچہ اپنے عشق ومحبت کی تمام یادوں کا مخزن ہے اور اس وجہ سے وہ اسے اپنی ذات کا پرتو خیال کرتے ہیں۔مصنف ایک جگہ لکھتے ہیں۔:

> میں نے کتاب کھولی، پندرھواں صفحہ آنکھوں کے سامنے آیا۔آہستہ سے پڑھنا شروع کیا۔''اے خدا تو نے زندگی اپنی مرضی کے مطابق دی۔اب موت تو میری مرضی کے مطابق بخش دے۔تجھ سے اور کچھ نہیں چاہتا ہوں خداوندا!''
>
> ''پھر موت!'' وہ بولی۔''برا شگون ہے۔''اس نے کتاب میرے ہاتھ سے چھین کر الگ کر دی۔اور اپنے لب میری طرف بڑھا دیئے۔غالیچہ ابل رہا تھا۔بالکل آگ تھا۔شعلوں کا دریا، پیپ کا سمندر، زہر کا کھولتا ہوا گرم چشمہ، میں نے اس سے پوچھا۔''تم نے آدمی کے بیٹے کو مسیحا بنا دیا۔بتاؤ مجھے کیا بناؤ گے؟''
>
> غالیچے نے کہا۔''جو تم خود بن چکے ہو، اک اہرام۔اک کھوکھلا اہرام جس کے سینے میں ممیاں دفن ہیں۔''
>
> میں نے اپنی محبوبہ سے کہا۔''میرا جی چاہتا ہے۔اس غالیچے کو جلا کر خاک کر ڈالوں۔''
>
> وہ بولی۔''ہاں! پرانا تو ہو گیا ہے۔''
>
> ''لیکن۔'' میں نے رک کر افسردہ لہجے میں کہا۔میرے پاس یہی ایک غالیچہ ہے اور یہی ایک زندگی ہے۔نہ اِسے بدل سکتا ہوں نہ اُسے...!!''

یہاں افسانہ نگار نے غالیچے کے تاثر کو شخصی پہلوؤں کے ساتھ پیش کر کے (Personification) مرکزی کردار کے ذہنی شدت کو عیاں کیا ہے۔

''کالو بھنگی'' اور ''بھگت رام'' میں پلاٹ کی بنیاد کو کرداروں کے ذہنی معیار پر مخصوص کیا گیا ہے۔ان دو افسانوں میں بچوں کے احساسات کی مدد سے کرداروں کی داخلی کوائف کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

علامت کا استعمال، استعاراتی اندازِ بیان کا ایک موثر طریقہ ہے۔علامت، بظاہر حقیقت سے بعید ہونے کے باوجود اپنی باطنی معنویت کے لحاظ سے اس سے قریب تر ہے۔کرشن چندر اپنی تخلیقات میں حقائق کی شدت کو بھر پور دکھانے کے لے جگہ جگہ رمزو کنایہ کے فن سے خوشہ چین رہتے ہیں۔

''دوفرلانگ لمبی سڑک'' میں سڑک، اور ''مہالکشمی کا پل'' میں پل، دونوں سرمایہ دارانہ نظام کی علامتیں ہیں۔

Monologue کی ہیئت افسانوی نثر اور تاثراتی اسلوب کے لیے سب سے موافق ہے کیوں کہ اس ساخت میں مصنف صیغۂ واحد متکلم کے ذریعے براہِ راست کردار کے نفسیاتی تجزیے پر روشنی ڈال سکتا ہے۔ اس لیے قارئین کو تھوڑی دیر کے لیے کردار کے ساتھ کہانی کی دنیا میں اتر کر تمام واقعات پر غور وفکر کرنے کا موقع مہیا ہوتا ہے۔ اردو افسانہ نگاری میں منٹو اور عصمت چغتائی نے اس ہیئت سے کہانیوں میں نفسیاتی حقیقت نگاری کا نیا رجحان پیدا کیا ہے۔ لیکن کرشن چندر بھی ان دو عظیم افسانہ نگاروں کے مانند اس فن سے خوب واقف ہیں۔ ''پورب دیس ہے دلی''، ''بے رنگ و بو''، ''جھیل سے پہلے جھیل کے بعد''، ''دسواں پل اور ''جنت اور جہنم'' میں افسانہ نگار، کرداروں کو مسافروں کے صورت میں دیارِ غیر کی سیر کراتے ہیں۔ ''نکڑ''، ''ایک گرجا اور ایک خندق''، ''ایک اکسٹرا لڑکی''، ''دل کا چراغ'' اور ''تین غنڈے'' میں شہری زندگی کی عکاسی کے ساتھ کرداروں کے ذہنی میلانات کی نمائش کی گئی ہے۔ کرشن چندر کے ہاں خطوط نگاری کا پیرایہ برائے نام ہے اور یہ تکنیکی اعتبار سے Monologue کے زمرے میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ اس میں بھی مرکزی کردار کے ذاتی شعوروں کے زاویے میں تمام باتوں کو غیر معروضی طور پر بیان کیا گیا ہے۔ ''گرجن کی ایک شام'' اور ''بالکونی'' اس کے دو اہم نمونے ہیں۔ کرشن چندر نے ''پشاور اکسپریس'' میں ٹرین کو Personifcation کے ذریعے ایک زندہ کردار کے روپ میں پیش کر کے حقائق کے بیان میں برقی تاثیر پیدا کر دی ہے۔ لیکن ان تمام افسانوں میں ایک مشترکہ وصف کرشن چندر کے اپنے ذاتی احساسات و تجربات ہے۔ دراصل یہ تمام کردار تخلیق کار کی ذات کا اوتار (Avatar) ہیں۔ اس لیے ان کرداروں کا پورا وجود ان کے نظریات وتصورات کی تبلیغ کا ایک کارگر ذریعہ بن کر افسانوی دنیا میں جلوہ افروز ہوتا ہے۔

''ان داتا'' تین مختلف کہانیوں پر مشتمل ہے۔ افسانہ نگار نے پہلی کہانی میں ایک غیر ملکی قونصل کو، دوسری کہانی میں ایک امیر زادے نوجوان کو، اور آخری کہانی میں ایک غریب مغنی کو مرکزی کرداروں کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ ہر کہانی ظاہراً آزادانہ حیثیت رکھنے کے باوجود اجتماعی طور پر ایک نکتے، یہاں میری مراد بنگال کے قحط کی طرف ہے، سے مربوط و وابستہ رہتی ہے۔ ان تینوں اجزاء میں فن کار قحط کے سانحہ کو مختلف زاویوں کے ساتھ بیان کر کے اس کا صحیح نقشہ اتارنے میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ چنانچہ اس افسانے میں بیان ہر اعتبار سے تہ دار ہے اور مصنف مختلف اسالیب اور کرداروں کے نقطۂ نظر کے تغیرات کے ساتھ قارئین کی توجہ کو آہسہ آہستہ کہانی کے مرکزی خیال کی طرف مرکوز کرتے ہیں۔

طنز ومزاح کا عنصر بھی کرشن چندر کی افسانہ نگاری کی ایک اہم خصوصیت رہی ہے۔ ویسے تو طنز کا پیرایہ انسان کی خوابیدہ حسیت کو جھنجھوڑ کر بیدار کرنے میں مددگار رہتا ہے۔ لیکن مزاحیہ رنگ کی ملاوٹ سے اس کی نشتریت میں مزید تاثیر پیدا ہوتی ہے کیونکہ مزاحیہ لب ولہجہ میں طنز کی کڑواہٹ مخفی ہونے کے باوجود بیان میں شیرینی اور چاشنی کا دھوکہ ظاہر ہوتا ہے۔ کرشن چندر نے طنز ومزاح کے پیرایوں کے ذریعے معاشرے کے مکارانہ وعیارانہ رویوں اور تصنع پسندی کو تازیانۂ قلم کا نشانہ بنایا ہے۔ خصوصاً سیاسی موضوعات کو طنز اور ظرافت کے ملے ہوئے رنگوں کے ساتھ بیان کر کے عالمی سیاست کے کئی اہم مسائل کو پر تاثیر انداز میں نمایاں کیا ہے۔

☆☆☆

خیر المجالس میں فارسی ادب

یاسرعباس،شعبہ فارسی، جامعہ ملیہ اسلامیہ،نئی دہلی

خیرالمجالس خواجہ نصیرالدین چراغ دہلوی کے ملفوظات کا مجموعہ ہے جسے حمید قلندر نے ۷۵۶ھ میں تدوین کیا۔اس مجموعہ میں چراغ دہلوی کی ان۱۰۰ مجالس کا ذکر ہے جس میں حمید قلندر خود شریک رہے تھے۔حمید قلندر نے خیر المجالس سے قبل شیخ برہان الدین غریب کے ملفوظات بھی مرتب کیے تھے۔اوراس مجموعہ کا نام ''اخبارالاخیار'' رکھا تھا جواب نایاب ہے۔دوسری مجلس میں حمید قلندر نے تحریر کیا ہے کہ انہوں نے ملفوظات برہان الدینؒ کو شیخ نصیرالدین دہلوی کے روبرو پیش کیا تھا۔

ملفوظ کی تعریف کے سلسلے میں مختلف اقوال ہیں جن کا خلاصہ ہم اس طرح کر سکتے ہیں کہ'' ملفوظات کے معنی ہیں اولیاءاللہ کا کلام،صوفی بزرگوں کا کلام،وہ کتاب جس میں کسی بزرگ کی کیفیت،اسکی اپنی زبانی لکھی گئی ہو۔عارف وصوفی حضرات کے فرمودات جوان کے مرید وخلفاء وجانشین نے جمع کر کے پیش کیے ہوں۔پروفیسر عراق رضا زیدی صاحب کے مطابق ''اگر کلام خدا کواس بحث سے بالاتر مانا جائے تو فرمودات پیغمبرؐ اکرم کو بھی جمع کر کے صحاح ستہ جیسی کتنی ہی کتابوں کی زینت بنایا گیا ہے۔گو کہ یہ بھی ملفوظات کی شکل ہے لیکن اسے'حدیث'' کا نام دیا گیا ہے۔اسی دور میں اہلبیت رسولؐ اور اصحاب رسولؐ کے کلام کو بھی جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔خصوصاً حضرت علی علیہ السلام کے فرمودات اس ذیل میں خاص توجہ کے طالب ہیں۔آپ کے ارشادات و اقوال کا مجموعہ ''نہج البلاغہ'' کے نام سے معروف ہے۔اوراسی مجموعہ کو کلام خدا و رسولؐ کے بعد ''ملفوظات'' کا منبع سمجھنا چاہیے۔(۱)

حمید قلندر کے احوال زندگی سے متعلق زیادہ اطلاع تو فراہم نہیں ہے لیکن خود خیر المجالس سے بہت سی اطلاعات آشکار ہوتی ہیں۔پہلی مجلس میں آپ لکھتے ہیں کہ وہ ایک مرتبہ حضرت سلطان الاولیاء کے یہاں اپنے والد مولانا تاج الدین صاحب کے ساتھ موجود تھے تو وہاں حضور کے ساتھ شرف طعام بھی میسر ہوا۔دسترخوان سے محبوب الٰہی نے روٹی کا ٹکڑا دیا جسے حمید قلندر نے آستین میں چھپالیا اور لے کر باہر چلے آئے۔باہر کچھ قلندر بیٹھے تھے انہوں حمید قلندر سے وہ ٹکڑا طلب کیا تو آپ نے وہ ٹکڑا قلندروں کے حوالے کر دیا جسے انہوں نے آپس میں تقسیم کرلیا۔والد نے پوچھا تو تمام احوال کہہ سنایا۔والد نے واپس محبوب الٰہی کی خدمت میں آ کر تمام واقعہ کہہ سنایا تو آپ نے کہا'' مولانا تاج الدین خاطر جمع رکھو یہ لڑکا تمہارا قلندر ہوگا''۔چنانچہ اس واقعہ کے علاوہ کوئی اور اطلاع حمید قلندر کے حوالے سے مذکور نہیں ہے۔کم ازکم میری دانست میں تو نہیں۔بہر حال جب یہ واقعہ حمید قلندر نے حضرت چراغ دہلوی کو سنایا تو وہ یوں گویا ہوئے'' مجھکو معلوم نہ تھا کہ تم مرید میرے شیخ علیہ الرحمہ کے ہو،آؤ بغلگیر ہو جائیں۔''(۲)

خیر المجالس یقیناً فوائد الفواد کے بعد ملفوظ نگاری کا بہترین نمونہ ہے اور یوں بھی قابل اعتبار ہے کہ خود چراغ دہلوی اسے وقتاً فوقتاً پڑھتے اور مشورہ دیتے رہتے تھے۔خیر المجالس میں جگہ جگہ فارسی شعراء اوران کے اشعار کا ذکر آیا ہے۔چراغ دہلوی نے فارسی اشعار کے ذریعہ اپنی بات کہی ہے نیز کہیں کہیں حمید قلندر نے اپنے اشعار بھی درج کیے ہیں لہذا مناسب سمجھا گیا کہ اسی پہلو کو عنوان بنالیا جائے۔

تیسری مجلس کے شروع میں مذکورہ شعر درج ہے ۔

ازین شربت دلم را زندہ کردی
خدایت شربت دیدار بخشد

اس شعر کا شان نزول یہ واقعہ ہے۔حضرت چراغ دہلوی نے ایک شیخ صاحب کا تذکرہ کیا کہ موصوف کے کرامات کا تذکرہ دور دور تک پھیلا ہوا تھا اور لوگ آپ کے مرید تھے لیکن قاضی شہر کو آپ سے ارادت نہ تھی۔ایک دن قاضی سے دوران گفتگو طے پایا کہ دونوں مل کر چلہ عبادت میں بیٹھیں۔

شیخ نے کہا مردوں کے چلہ میں بیٹھو گے کہ عورتوں کے۔ چلہ میں مردوں کا چلہ تو یہ ہوتا ہے کہ روز دو بکرے، دو مَن روٹیاں کھائیں اور چالیسویں دن اسی وضو سے جو پہلے دن کر کے بیٹھے تھے باہر نکلیں اس عرصہ میں نہ کھانا کم ہو نہ وضو نیا کریں۔ اور عورتوں کا چلہ یہ ہے کہ اول دن غسل و وضو کرے اور چلہ میں بیٹھ کر اتنے دنوں کچھ نہ کھائے اسی پہلے وضو سے باہر نکلیں۔ دونوں میں طے پایا کہ مردوں کا چلہ کریں۔ جب پہلا دن چلے کا تمام ہوا افطار کا وقت آیا تو مریدوں نے دو بکرے اور دو مَن روٹیاں شیخ کے حجرے کے روبرو رکھدیں اسی قدر قاضی کے دروازے پر بھی۔ شیخ نے مقررہ غذا تناول کر لی اور قاضی صاحب دو روٹیاں کھا کر رہ گئے۔ شیخ نے دیکھا تو کہا یاروں کو خالی نہ چھوڑنا چاہیے اور قاضی کا کھانا بھی کھالیا۔ حجرے میں آکر نماز عشاء پڑھی ہی تھی کہ قاضی کے شکم میں درد ہوا۔ کہا ایسی نماز مکروہ ہے اٹھا اپنا چلہ توڑ ڈالا۔ قاضی قدموں پر گر پڑا۔ شیخ نے کہا جو چیز میں نے اپنے اوپر لازم کر لی ہے اس کو پورا کرنا ضروری ہے۔ روزانہ بعد مغرب شیخ کے حجرے کے روبرو چار بکرے چار مَن روٹیاں رکھدی جاتی۔ شیخ بعد مغرب سب کھالیتے۔ چلہ تمام کیا تو اسی وضو سے باہر نکلے اور اس عرصہ میں تازہ وضو کی حاجت نہ ہوئی۔ یہ کرامت دیکھ کر قاضی شیخ کا مرید ہو گیا۔

انیسویں مجلس میں مذکور ہے کہ بارگاہ چراغ دہلوی میں باریابی نصیب ہوئی تو خواجہ پر حال طاری تھا مزاج ناساز تھے دست مبارک سے زمین پر تکیہ کیے ہوئے تھے کہ فرمایا عین القضاۃ ہمدانی نے اپنی کتاب میں لکھا ہے۔

بر خاستن زجان و تن می باید سر آمدہ ز خویشتن می باید
در ہر قدمی ہزار بند افزون است زین گرم روی بند شکن می باید(۳)

حمید قلندر نے خواجہ کے پاؤں مبارک کے زخمی ہونے پر بطور عیادت جو رباعی کہی تھی اسے ستاونویں مجلس میں ذکر کیا ہے

درد دل عاشقان ازین بیرون است ہر چند دوا کنند درد افزون است
آن درد نہ پرسم کہ ز عشق است بدل ای درد بگو پای مبارک چون است(۴)

اسی طرح ترپن ویں مجلس میں بھی ذکر ہے کہ خواجہ کے پائے مبارک سوج گئے تھے اور درد تھا۔ میں نے یہ رباعی پڑھی خاطر مبارک کو خوشی ہوئی:

آماس کہ از پای مبارک زاد است زانست کہ بوسہا ملائک داد است
یا خود ز جہاں ہمی رود بہر وداع درد آمدہ در پای شما افتاد است(۵)

اسی مجلس کے آخر میں خواجہ نصیر الدین نے حکایت بیان کی ہے، جس کے ذیل میں خواجہ نظامی کا مذکورہ شعر پڑھکر فرمایا کہ حضرت نظامی رحمۃ اللہ علیہ شکم مادر ہی سے پارسا تھے اور مجاہدہ اپنے اوپر وہیں سے لازم کر لیا تھا شعر یہ ہے:

نظامی تا توانی پارسا باش
کہ نور پارسائی شمع دلہاست

انسٹھویں مجلس میں رابعہ بصری کی حکایت بیان کرنے کے بعد وہاں موجود مولانا کمال الدین اور مولانا شمس الدین رجزی کو اشارۃً کہا میرے خیال میں یہ قلندر شاعر ہے۔ اس نے غزل مستزاد مولانا جامی پر غزل کہی ہے۔ جناب خواجہ نے مطلع اور حسن مطلع مولانا کی اس غزل کا خود پڑھا:

آن کیست کہ تقریر کند حال گدا را۔۔۔۔۔ در حضرت شاہی
از غلغل بلبل چہ خبر باد صبا را ۔۔۔۔۔بر نالہ و آہی

حمید قلندر نے بھی اپنے چند شعر پڑھے:

آن کیست کہ بگذشت بریں سوی سوارا کج کردہ کلاہی
غربال ہدف ساخت ز مژگان دل مارا ☆ نا کردہ نگاہی

تا جملہ ولایت سفیدی و سیاہی در دائرہ آرد
برر وم نگر حضرت سلطان خطارا از شام سپاہی
با کو نگہ حسن برون راندہ و شہری ☆ شورید بدنبال
دانی طرب انگیز بود ما و شما را نظارۂ شاہی
آخر سر و پالی کن و یادی بکن از من ☆ یعنی چہ شدش حال
ما خورد نکوئی و دہ آن سروپارا یا مرد بجائی(٦)

مذکورہ بالا اشعار سے خواجہ کے ذوق اور حمید قلندر کے فنی کمال کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حمید قلندر مستزاد پر بھی قدرت رکھتے تھے۔

٦٥ ویں مجلس میں شیخ فرید الدین عطار کا تذکرہ کیا ہے۔ فرمایا شیخ فرید الدین ملتان میں طالب علم تھے اور سرائے حلوائی کی مجلس میں مقیم تھے حضرت شیخ قطب الدین ملتان تشریف لائے تو پہلے اسی مسجد میں آئے دو رکعت نماز نفل پڑھی اور حضرت شیخ فرید الدین گوشۂ مسجد میں بیٹھے ہوئے کتاب نافع کا جو فقر میں ہے مطالعہ کر رہے تھے بعد نماز حضرت قطب الدین سر پر آ کر کھڑے ہو گئے پوچھا میاں طالب علم یہ کونسی کتاب ہے عرض کیا کہ کتاب نافع ہے۔ شیخ قطب الدین نے فرمایا تمہارا اس کتاب کے پڑھنے میں کیا نفع ہے۔ شیخ فرید الدین نے کہا میرا نفع آپ کی نظر کیمیاے سعادت بخش میں ہے اور یہ کہکر حضرت شیخ قطب الدین کے قدموں پر گر پڑے اس وقت جناب قطب الدین صاحب نے یہ رباعی پڑھی:

مقبول تو جز مقبل جاوید نشد وز لطف تو ہیچ بندہ نومید نشد
لطفت بکدام بندہ پیوست دمی کان ذرہ بہ از ہزار خورشید نشد(٧)

٩٨ ویں مجلس میں آپ نے حافظ کے مذکورہ ذیل شعر پڑھا اور اس کی تشریح میں اس طرح گویا ہوئے:

فرمایا تعب و مشقت اعمال میں نفس کو ہوتا اور روح کو لذت حاصل ہوتی ہے اور آرام پاتی ہے کہ درد اور تھکاوٹ فراموش ہو جاتی ہے اور اس کی مثال میں فرمایا کہ جناب آنحضرتؐ کے قدم مبارک طول قیام سے نماز شب میں ورم کر جاتے تھے اور اگر اس عبادت میں ذوق و راحت نہ ہوتے تو قیام ممکن نہ ہوتا اور دوسری مثال یہ کہی کہ ایک بار حضرت علیؑ کے پاؤں میں ایسا کانٹا چبھا تھا کہ اس کا نکالنا دشوار تھا جب آپ نماز میں مشغول ہوئے تو یاد الٰہی میں ایسے مستغرق ہوئے کہ لوگوں نے وہ خار قدم مبارک سے کھینچ لیا اور آپ کو خبر نہ ہوئی۔ اور حافظ کا یہ مصرع پڑھا:

کہ عشق آسان نمود اول ولی افتاد مشکلھا(٨)

خیر المجالس میں جا بجا اشعار، حکایات اور شعرا کے ذکر سے اس نتیجہ پر پہنچنا غلط نہ ہوگا کہ حمید قلندر محظ قلندر با مسمیٰ نہ تھے بلکہ اعلیٰ ادبی ذوق کے حامل بھی تھے۔ چنانچہ یہ علمی و ادبی واقعات و اشعار اس مفروضہ پر دال ہیں۔ علاوہ برآن خود حضرت چراغ دہلوی کی نشستیں یا مجلسیں محظ پند و وعظ کی مجلسیں نہ تھیں بلکہ ان میں علم و ادب کی گفتگو بھی اپنا مقام رکھتی تھی۔ کچھ مقامات پر تو خود چراغ دہلوی نے حمید قلندر کو مضمون کو نظم کرنے کا حکم دیا ہے۔ مثلاً حمید قلندر نویں مجلس میں تحریر کرتے ہیں سعادت قدمبوسی میسر ہوئی خواجہ ذکر اللہ تعالی بالخیر اس وقت حال و کیفیت میں تھے پوچھا کیا لکھتا ہے پھر فرمایا اس باب میں کچھ کہو ؎

گہی صوفی گہی قلندر

بندہ نے فی البدیہہ یہ مصرع لگایا۔ ؎

گاہ صوفی و گہہ قلندر چیست

فرمایا دوسرا مصرع بھی کہو ؎

چون قلندر شدی قلندر باش

متعدد مقامات پر حضرت نصیرالدین چراغ دہلوی نے متعدد فارسی شعرا کا تذکرہ کیا ہے۔اوران کی زندگی پر روشنی ڈالی ہے۔بیسویں مجلس میں حکیم سنائی کے حوالے سے مفصلاً گفتگوفرمائی ہےاور سنائی کے وہ احوال بیان کئے ہیں جن کے بارے میں تذکروں اور تاریخوں میں بہت کم بیان کیا گیا ہے۔ان کی شاعری کی ابتدااور تصوف کی طرف میلان کا بھی شاذ و نادر ہی تذکرہ ملتا ہے جسے خواجہ نصیرالدین نے تفصیل سے ذکر کیا ہے۔حکیم سنائی کے والد کا نام مخدوم اور دادا کا نام آدم تھا۔ان کے والد ایک مجذوب کے معتقد تھےاوراس کی خدمت کیا کرتے تھےاسی سلسلے میں خواجہ نصیرالدین نے فرمایا:

''حکیم سنائی کے والد سے ایک دن وہ مجذوب بولا تیرے یہاں ایسا لڑکا پیدا ہوگا کہ شہرہ اس کا اقلیموں میں پہنچے گا اور صاحب ولایت و کرامت ہوگا۔ یہ کہہ کر چندروز بعد وہ دیوانہ مرگیا۔سنائی کی ولادت ہوئی جب بڑے ہوئے تو کوئی علامت ان میں نہ تھی اور کچھ نشان صلاحیت ظاہر نہ تھا۔ایک دن والد نے بلاکرتمام واقعہ سنایااور کہاتم میں ایسی کوئی صلاحیت نظرنہیں آتی ہےاور آج تک اس دیوانہ کی کوئی بات غلط نہیں ہوئی مگر میں تجھ میں کوئی علامت اس کی نہیں پاتا۔چل میں تجھ کواس کی قبر پہ لے چلوں۔سنائی کواس کی قبر پہ لے جاکر سامنے کھڑا کیااور کہااے خواجہ آپ نے اس لڑکے کے حق میں جو کچھ فرمایا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔پھران دونوں سے کہا بیٹھو کھاؤ۔انہوں نے بلاکراہیت وہ ثرید کھایااور پیالہ چاٹا تب درویش نے کہا آدمی جب تک خون نہیں کھاتا مردنہیں ہوتا۔اب تم نے خون کھالیا جاؤ مرد ہوگے۔خواجہ سنائی پرعلم نظم کھل گیا کہ وہ اس میں شہرہ آفاق ہوئے اور صاحب سخن اور صاحب ولایت دونوں ہوئے اور شیخ خیرآبادی کوولایت نصیب ہوئی کہ راہ تصوف ان پر روشن ہوئی۔(۹)

ص۱۵۲ پرامیر خسرو۔امیر حسن سعدی وسنائی کی شاعری پرتبصرہ کیا ہے۔شیخ ابوسعید ابوالخیر کی زندگی کے روشن ابواب کامختلف مقامات پرتذکرہ کر کے اپنی مجالس منور کی ہیں۔ بہرحال تصوف فارسی ادب کا ایک اہم جز ہے۔اور شیخ چراغ دہلوی کے زمانہ میں فارسی زبان ہندوستان میں عروج پرتھی لہذاحضوروالا نے فارسی اشعار سے بہت استفادہ کیا ہےاور فارسی اشعار سےاپنے فرمودات کومزین کیا ہے۔

جس طرح فارسی ادب کا ایک اہم جز تصوف وعرفان ہے بغیر تصوف فارسی ادب غیرمکمل ہے اسی طرح تصوف وعرفان بھی فارسی کے بنا نامکمل ہیں۔کیونکہ تصوف کی زیادہ تر کتابیں فارسی ہی میں ہیں اور ہندوستان کی سب سے پہلی تصوف کی کتاب ''کشف المحجوب'' بھی فارسی میں ہے۔

ماخذومنابع:

۱۔ادبیات ملفوظات فارسی،ص۱۲۵
۲۔پہلی مجلس،خیرالمجالس،حمیدقلندر،ص۵،ناز پبلشنگ ہاؤس پہاڑی بھوجلہ،دہلی۔۶
۳۔انیسویں مجلس ص۱۰۲،ایضاً
۴۔ستاونویں مجلس ص۲۳۵،یضاً
۵۔ترپن ویں مجلس،ص۲۰۵،ایضاً
۶۔انسٹھویں مجلس،ص۲۳۶،ایضاً
۷۔پینسٹھویں مجلس،ص۲۶۲،ایضاً
۸۔اٹھانویں مجلس،ص۳۳۳،ایضاً
۹۔بیسویں مجلس،ص۴۷،ایضاً

☆☆☆

مغل شہزادیوں کی فارسی ادب سے دلچسپی

محمد مبارک حسین، ریسرچ اسکالر، شعبۂ فارسی، اے، ایم، یو۔ علیگڑھ

مسلمانوں کے عروج اور بلندی کا بھی کیا زمانہ تھا کہ اس کے خیال تک سے ایک عجیب مسرت پیدا ہوتی ہے کسی قوم کی حالت کو جانچنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس کی عورتوں کے حالات کا مطالعہ کیا جائے جب ہم اپنے گزشتہ زمانے پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں ہماری عورتوں کو وہ درجہ حاصل تھا جو خدا نے ان کے لئے مقرر فرمایا ہے، تمام دنیا کی دوسرے اقوام اور دوسرے مذاہب کے مقابلے میں مسلمانوں میں عورتوں کا وقار زیادہ تھا، عورتوں کے دماغ تعلیم کی روشنی سے منور کرائے جاتے تھے اور انہیں معمولی نہیں بلکہ اعلی درجے کی تعلیم حاصل کرنے کا موقع دیا جاتا تھا۔ وہ اپنے جملہ فطری حقوق سے متمتع تھیں اگر اس زمانے کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو مشاہیر مردوں کے پہلو بہ پہلو مساوی تعداد میں انہیں اوصاف وخوبیوں سے متصف خواتین بھی بکثرت ملتی ہیں جن کے حالات آج کل کی بیبیوں کیلئے ازبس سبق آموز وحوصلہ افزا ثابت ہونگے۔

ادب خواہ وہ کسی بھی زبان کا ہو زندگی کا آئینہ اور سماج اور معاشرے کا عکس ہوتا ہے اور ہر تہذیب اپنے عقائد اور قدروں کو محفوظ رکھنا چاہتی ہے اور ان کا اظہار بھی کرتی ہے جیسا کہ ہندوستان کی تاریخ میں مغلیہ دور کی تہذیب اور خاص کر عہد اکبری کئی اعتبار سے نہایت اہم دور کہلاتا ہے۔ اکبر کے اندر انسان دوستی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اس نے ادب وفن اور اس سے وابستہ انسان کی بے حد عزت واحترام کی اس نے اپنے زمانے کے ادیب وفنکار کو اپنی رائے بیان کرنے پر پابندی عائد نہیں کیا۔ وہ خود تو باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کیا تھا اس کے باوجود زندگی کے اوپری خول کو نہیں بلکہ اسرار حیات کی پردہ کشائی اور اس کی حقیقتوں تک رسائی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ جس کے لئے اس بادشاہ نے اپنے دربار میں شہزادیوں کے ادب کو فروغ دیا اور خود بھی ان ادب میں دلچسپی کے ساتھ حصّہ لیا۔ جیسا کہ اکبر کے زمانے میں تہواروں میں نوروز ''خوش روز'' کے مبارک نام سے موسوم تھا، اس روز رؤساء اور امرا کی بیگمات، عورتیں شاہی محل میں دکانیں لگاتی تھی بادشاہ خود شمع بزمِ عیش کو روشن کرتا تھا اور امرا اس میں شرکت کرتے تھے

ترکستان کے ہر شہر اور ہر قصبہ میں ہر ہفتہ اور کچھ جگہ دو بار بازار لگتے تھے اس بازار میں ہر قسم کے سامان جیسے سوت، ٹوپیاں، رومال، پھلواڑی، دستکاری، انڈے، گھوڑے، گزی گاڑھے سے لیکر قیمتی قالین اور ریشمی کپڑے میوہ جات، غلہ گھی، غرض کہ ضروریات کی تمام چیزیں ملتی تھیں اکبر نے بھی اپنے عہد میں ایسا ہی بازار لگوایا جو ہر مہینے معمولی بازار کے تیسرے دن قلعہ میں زنانہ بازار لگتا تھا اور اس بازار کا نام ''مینا بازار'' رکھا غالبًا یہ امر قانون میں داخل ہوگا عمل اس پر کبھی کبھی ہوتا ہوگا انہیں ایوانوں میں جو درحقیقت ایجاد اور عقل وشعور کے بازار تھے۔ اس زنانہ بازار میں محل کی بیگمات آتی تھیں کہ ذرا ان کی آنکھیں کھلیں اور سلیقے سے آنکھوں میں سرمہ لگائیں۔ وہاں ہر قسم کی اشیاء بکنے آتی تھیں۔ شاہی بیگمات کے علاوہ امراء اور شرفا کی بہو، بیٹیوں کو بھی اجازت تھی کہ جہاں چاہیں آئیں اور تماشا دیکھیں وہ ملکی مصنوعات کو دیکھ کر حیران رہ جاتی تھیں۔ دکانوں پر تمام عورتیں بیٹھتی تھیں، سوداگری اور سودا زیادہ تر زنانہ رکھا جاتا تھا۔ ایک دن میں لاکھوں کی خرید وفروخت ہوجاتی تھی۔ خواجہ سرا، قلماقنیاں، اروہ بیگنیاں اسلحۂ جنگ سجے، انتظام کے گھوڑے دوڑاتی پھرتی تھیں۔ عورتیں ہی پہروں پر ہوتی تھیں مالیوں کی جگہ مالنین چمن آرائی کرتی تھیں۔ اسی کا نام ''خوش روز'' تھا''

نیک نیّت بادشاہ آپ بھی آتا تھا اور اپنی رعیت کی بہو بیٹیوں کو دیکھ کر ایسا خوش ہوتا تھا کہ ماں باپ بھی اتنا ہی خوش ہوتے ہونگے۔ بادشاہ سے ہر طبقہ کی لڑکیاں بڑی بیبا کی سے باتیں کرتی تھیں ایک دن ایک لڑکی نے ''ململ'' لیکر اکبر بادشاہ کے سامنے پیش کی جو سوا گز عرض کا بیس گز کا تھان تھا یہ اس قدر باریک تھا کہ تہہ نے بعد ہتھیلیوں کے بیچ میں آ گیا تھا اس کے علاوہ اور بھی دوسری مصنوعات ایسی ہی نفیس ہوتی تھیں بادشاہ جہاں مناسب جگہ دیکھتے تھے بیٹھ جاتے تھے بادشاہ بیگم، بہنیں، بیٹیاں، پاس بیٹھتی تھیں۔ امراء کی بی بیاں سلام کردیتیں۔ نذریں دیتیں، بچوں کو سامنے حاضر کرتیں۔ ان کی نسبتیں حضور میں قرار پاتی تھیں حقیقت میں یہ بھی آئینِ سلطنت کا ایک حصّہ تھا۔ اسی مینا بازار میں جہانگیر نے نور جہاں کو دیکھا تھا جہاں پر تجمال لڑکیاں اپنے برقپاش

حسن سے ضیا باری کر رہی تھی نور جہاں جس کی قسمت میں ہندوستان کا ملکہ ہونا لکھا تھا اس بازار میں اپنے حسن جہاں سوز سے ہر ذرّہ اور پتہ کو منوّر کرتی باغیچہ میں آنکلی جسے دیکھتے ہی کلیوں میں نزہت اور پھولوں میں تازگی آ گئی۔

اکبر بادشاہ نے اپنے دورِ اقتدار میں علوم وفنون کی ترقی کے لئے مؤرخوں، خطّاطوں، موسیقاروں، ادیبوں، شاعروں، مصوّروں، اور علما و فضلاء کی ایک بڑی جماعت کو دربار سے منسلک کرنے کے ساتھ ساتھ خواتین کو بھی ادب میں حصّہ لینے کا موقع دیا جس کے اثر ورسوخ کی بدولت خواتین کی زندگی بدل گئی طور طریقے بدل گئے ان خواتین میں عرب اور ایران، ترک اور تورانی مغل اور افغانی تہذیبوں کے علمبرداران شامل تھیں۔ فارسی ادب میں ایسی بے شمار ادیبہ ہیں جن کے احوال وتخلیقات ہنوز معرضِ خفا ہیں۔ لہذا بندہ کی اس حقیر سی کوشش میں ایسی خواتین کو اس مقالے کا موضوع بنایا ہے جن کی تخلیقی کاوشیں ہنوز پردۂ خفا میں ہیں اور ان خواتین کا تعلق مغلیہ دور سے ہے۔ دراصل اس دور میں فارسی زبان وادب کا تعلق سلاطین وامراء سے رہا ہے جن کی سر پرستی میں یہ زبان وادب ارتقاء پذیر ہوا کیونکہ فارسی ادب اپنے علمی خزانہ اور شعر وادب کے گنجہائے گرانمایہ کی وجہ سے دنیا کی تمام زبانوں میں غیر معمولی قدر و قیمت کی حامل ہے اس کی جڑیں ایران ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی تاریخ میں بھی بہت دور تک پھیلی ہوئی نظر آتی ہیں۔

عہدِ اکبر میں جن خواتین نے ادبی کارنامے انجام دئے ہیں ان میں سب سے پہلے گلبدن بیگم ظہیر الدین محمد بابر کی بیٹی ہمایوں کی بہن اور بادشاہ اکبر کی پھوپھی بڑی قابل اور عالمہ خاتون تھیں۔ گلبدن بیگم ۱۵۲۳ء میں افغانستان میں پیدا ہوئی اس شہزادی کے ایام رضاعت وتربیت وآسائش سکون سے خالی ہیں اسی بنا پر اپنے قبیلے کی عورتوں اور اپنی سہیلیوں سے الگ تھلگ ہو کر خانہ داری کے کاموں میں مشغول اور منہمک رہتی تھی خدا داد دماغ پانے کے ساتھ پڑھنے لکھنے کا بے حد شوق تھا اور ہمیشہ علمی مشاغل میں ہمہ تن مستغرق رہتی تھیں۔ آپ شاہی خاندان کے خواتین کے ساتھ ۱۵۵۷ء میں ہندوستان پہنچی تھیں۔ اس شہزادی کی تصنیف ''ہمایوں نامہ'' آج تک اپنی شہرت برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ اس تصنیف سے گلبدن کی علمی قابلیت و شخصیّت کا اندازہ ہوتا ہے گلبدن نے اپنی اس کتاب میں ان تمام واقعات کو بیان کیا ہے جن کو انہوں نے اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کئے ہیں یا پھر معتبر ذریعہ سے اس کی اطلاع ان تک پہنچی ہیں اس کتاب میں واقعات بہت آسان لفظوں میں بیان کیا ہے اور طرزِ تحریر میں طبیعت کا دخل نظر نہیں آتا ہے بلکہ زمانہ اور وقت کا تتبع کیا ہے۔ یہ کتاب بابر اور ہمایوں کے زمانے کے تمدنی، معاشرتی، اور تاریخی واقعات پر بہترین کتاب ہے اس کتاب کے لیے بادشاہ اکبر نے اپنے دادا بابر اور والد ہمایوں کے حالات جاننے کے لیے لکھنے کی گزارش کی تھی۔ اس کتاب کی انشاپردازی پر علامہ شبلیؒ کی تحریر اچھی روشنی ڈالتی ہے:

''فارسی زبان میں سادہ اور صاف واقعہ نگاری کا عمدہ سے عمدہ نمونہ تزک جہانگیری اور رقعات عالم گیری ہیں اور اس میں شبہ نہیں کہ یہ کتابیں سادگی اور لطافت کے اعتبار سے اس قابل ہیں کہ ہزاروں ظہوری اور وقائع نعمت خان ان پر نثار کردی جائیں لیکن انصاف یہ ہے کہ ہمایوں نامہ کچھ ان سے بھی آگے بڑھا ہوا ہے، اس کے چھوٹے چھوٹے فقرے، سادہ اور بے تکلف الفاظ، روز مرّہ کی بول چال، طرز ادا کی بے ساختگی دل کو بے اختیار کر دیتی ہے''(۲)

اس تصنیف میں گلبدن اپنے زمانے کی عورتوں کی معاشرتی، اور خانگی زندگی کو واضح انداز میں بیان کیا ہے جس سے علم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں عورتیں پڑھنے لکھنے کے ساتھ ساتھ فنون سپہ گیری، سیر وشکار، گھوڑسواری، چوگان بازی، تیراندازی، اور ساز بجانے کے علم سے بھی واقف تھیں اور بعض عورتیں اس وقت بھی مردانہ لباس میں ملبوس رہتی تھیں۔ گلبدن کے ہمایوں نامہ کے علاوہ اس نام سے اور بھی چند کتابوں کے نام جن میں، بایزید کا ہمایوں نامہ یا تاریخ ہمایوں، خوندمیر کا قانونِ ہمایوں اور جوہر آفتابچی کا ہمایوں نامہ کتب تاریخ میں درج ہیں خدا نے اس مقدس خاتون کو جہاں بہت سی قابلیتیں اور قوّتیں عطا کی تھیں وہاں شاعرانہ دماغ بھی مرحمت فرمایا تھا اور وہ اس فن میں کامل دستگاہ رکھتی تھیں۔

ہر پری کہ او با عاشق خود یار نیست　　　تو یقین می داں کہ ہیچ از عمر برخوردار نیست

عہد مغلیہ کی شہزادیوں کا ممتاز سلسلہ انہی سے شروع ہوا۔

نور جہاں اس کا اصل نام مہر النسا تھا (''نور جہاں'' جہانگیر نے خطاب دیا تھا۳) اپنے زمانے کی صاحب علم وقلم خاتون گزریں ہیں کیونکہ وہ

ایک علم پرور باپ کی بیٹی تھی اور قدرت کی طرف سے علم وادب کی دولت سے بھی سرفراز تھی اور ایک ادب پرداز شاعر کی بیوی تھی، اس ملکہ کی پیدائش کے سلسلے میں کہا جاتا ہے کہ قندھار کے جنگل میں جب اس کے والد شاہ صفوی کے عتاب کا شکار ہو کر ہندوستان کے سفر پر تھا اسی بے سروسامانی کے عالم میں قندھار کے جنگل میں اس ملکہ کی پیدائش ہوئی نور جہاں کو ہندوستان کی تاریخ میں جو عظمت حاصل ہے وہ کم ہی شہزادیوں کو ہوئی ہوگی اور خاص کر خواتین میں سب سے ممتاز شخصیت کی مالک تھی حسن وصورت وسیرت کے ساتھ ایجاد واختراع کی غیر معمولی صلاحیت اس کو ودیعت کی گئی تھی اسکی ذات حسن صوری ومعنوی کا بیش بہا مرقع اور ایک مثالی کردار پیش کرتی ہے ڈاکٹر نذیر احمد صاحب نے اس خاندان کے بارے میں لکھا ہے کہ ''نور جہاں کا آبائی خاندان رے اور تہران میں نہایت معزز اور محترم تھا'' (معارف جولائی ۱۹۵۸ء)

نور جہاں کا خاندان صرف ایران ہی نہیں بلکہ ہندوستان میں بھی معزز اور محترم رہا ہے اور کئی ایسے ہنرمندوں کو پیدا کیا جو امارت ووزارت اور شعروسخن کے ماہر تھے۔ نور جہاں کی جس وقت شادی ہوئی اس وقت اس کی عمر ۳۴، برس تھی اس عمر میں عورت کے حسن میں انحطاط شروع ہوجاتا ہے مگر نور جہاں کے حسن وجمال میں ذرّہ برابر بھی کمی نہ ہوئی تھی اس ملکہ کی شادی کے سلسلے سے تاریخوں میں یہ روایت بہت مشہور ہے کہ جہانگیر اور نور جہان کی شادی کے سلسلے سے قیاس آرائی بہت کی گئی ہے اور اسے متنازع بنادیا گیا بعض مؤرخ نے قصداً جہانگیر پر نور جہاں کے پہلے شوہر شیر افگن کے قتل کا الزام عائد کیا ہے اور دونوں کے عشق بازی کا تانا بانا بنادیا۔ یہ افواہ اس وقت پھیلی جب نور جہاں کا اثر ورسوخ بڑھنے لگا اور اپنے داماد شہریار کی جانشینی کیلئے راستہ ہموار کرنے کی کوشش کی۔

بہر حال واقعہ جو بھی ہو نور جہاں اپنے شوہر جہانگیر سے بے انتہا محبت کرتی تھی اور پوری زندگی خوش ہو کر گزاری وہ اپنی خداداد صلاحیت سے حاضر جواب اور حوصلہ مند تھی تہذیب وشائستگی اور ذہنی استعداد سے دلوں کو موہ لینے والی باتیں کرتی تھی جس کی بنا پر جہانگیر نے ''بادشاہ بیگم'' کا خطاب دیا اور سکّوں پر ان کا نام لکھوایا۔ خطبہ میں تو نور جہاں کا نام نہ تھا لیکن سکّہ میں اس کا نام اس طرح تھا۔

بحکم شاہ جہانگیر یافت صد زیور　　　بنامِ نور جہاں بادشاہ بیگم زر

فارسی زبان کی با کمال شاعرہ اور ادیبہ تھی کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ جہانگیر نے اپنے نئے لباس کو لعل کے تکموں سے مزین کروایا تو نور جہاں نے برجستہ فرمایا۔

ترا نہ تکمہ لعل است درلباس حریر　　　شدہ است قطرۂ خوں منت گریباں گیر (بزمِ تیموریہ جلد سوم، ص ۲۲۶)

اسی طرح ایک بار محرم ۱۰۲۸ھ میں نور جہاں نے دمدار ستارہ دیکھا تو فی البدیہ اس کی زبان سے یہ شعر نکلا۔

ستارہ نیست بدین طول سر برآوردہ　　　فلک بشاطری شہ کمر برآوردہ (بزمِ تیموریہ جلد سوم، ص ۲۲۷)

ایک مرتبہ جہانگیر نے چشم ابروئے غضب سے نور جہاں کو دیکھا تو نور جہاں نے آزردہ ہو کر یہ جواب دیا۔

ما تنگ ظرفاں حریف این قدر سختی نئیم　　　دانہ اشکیم و مارا گردش چشم آسیاست

وہ صرف شاعرہ وادیبہ ہی نہیں بلکہ میدانِ جنگ میں بھی بہادر تھی وہ جنگ کے میدان سے پیچھے ہٹنا نہ جانتی تھی، گھوڑے پر اس طرح سوار ہوتی تھی کہ شہسوار دنگ رہ جاتے تھے، شکار میں بھی ماہر تھی نشانہ ایسا سدھا ہوتا تھا کہ کبھی خطا نہ جاتی تھی، گھر کے کاموں میں بھی لاثانی تھی غرض کہ ان میں ساری خوبیاں تھیں۔ شروع شروع مین کھانوں میں بڑی جدّت پیدا کی، پھر لباس میں نئے نئے انداز ایجاد کئے۔ دودمی، پستولیا، کناری،، فرش، چاندی اور مرصع زیورات اس نے ایجاد کئے، سلیم شاہی جوتہ اسی کی ایجاد ہے گلاب کا عرق اور عطر اسی نے نکالا۔ تاریخ ہند، ص ۵۴۱

جہاں آرا بیگم۔ جہاں آرا صاحبقراں ثانی محمد شہاب الدین شاہجہاں بادشاہ کی بیٹی تھی عمر میں اپنے بھائی عالمگیرؒ سے بڑی تھی ۱۰۲۳ھ میں پیدا ہوئی اس کی ماں ارجمند بانو بیگم ملقب ممتاز محل تھی جس کا مقبرہ آگرہ میں ہے اور جو دنیا میں بلحاظ خوبصورتی کے بے نظیر اور بے مثل ہے۔

جہاں آرا کو تعلیم سے بے حد شوق تھا جب وہ سن شعور کو پہنچی تو اس کی تعلیم کیلئے صدر النساء خانم عرف ستی النساء مقرر کیا گیا ستی النساء طالب آملی

مشہور شاعر کی ہمشیرہ تھی جو عہد جہانگیر کا ایک ممتاز سخن سنج تھا۔اس نے پہلے شاہزادی کو قرآن مجید پڑھایا اس کے بعد فارسی ،علم قرأت ،اور نظم ونثر کی تعلیم دی اور تھوڑے ہی زمانے میں اس کو لکھنے پڑھنے میں ماہر کر دیا اور ساتھ ساتھ کتب بینی کا ایسا شوق پیدا کر دیا جس کو اس نے عمر بھر قائم رکھا۔

جہاں آرا نہایت حسین شہزادی تھی اور بہت شان وشوکت کے ساتھ رہتی تھی شاہجہاں کو ان سے بڑی انسیّت تھی اس کی سالانہ جاگیر ساٹھ لاکھ روپے اس کے مصارف کے لیے مقرر تھے۔اس کی سواری بڑی شان وشوکت کے ساتھ نکلتی تھی کبھی کبھی بلند ہاتھی پر سوار ہو کر نکلا کرتی تھی۔جس پر نہایت زرق برق وشاندار ہودج کسا ہوتا تھا۔اس شاہزادی کی شادی نہیں ہوئی تھی اور یہ صرف اسی پر موقوف نہیں ہے بلکہ اس خاندان کی اکثر شہزادیوں کی شادی نہیں ہوئی اس کی وجہ تو ہم پرستی ہے کتب تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سیاسی بنیاد پر شاہان مغلیہ اپنی لڑکیوں کی شادی نہیں کیا کرتے تھے کیونکہ جن لوگوں سے ان کے تعلقات پیدا ہوئے وہ بغاوت سے بعض نہیں رہے۔اس کے علاوہ ان بیگمات کی شادی نہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کی شادی کے واسطے ایسے لوگ بھی مشکل سے مل سکتے تھے جو بہ لحاظ عزت وحرمت کے شاہان مغلیہ کے نزدیک اس قابل ہوں کہ ان کے ساتھ شاہزادیوں کا نکاح کیا جائے۔اس شہزادی کی شادی تو نہیں ہوئی تھی لیکن اولاد کا انہیں بہت شوق تھا اسلئے اس نے داراشکوہ کی بیٹی ''جہاں زینب بانو بیگم'' کو بعد قتل داراشکوہ متبنیٰ بنا کر لیا تھا اور عمر بھر اس کو بطور اولاد کے رکھا اور جب یہ جوان ہوئی تو عالمگیر بادشاہ نے یہ خواہش کی کہ اس کی شادی شہزادہ محمد اعظم کے ساتھ کر دی جائے جہاں آرا اس پر راضی تو نہیں ہو رہی تھی لیکن بادشاہ عالمگیر نے منا لیا اور ۱۶۶۸ء میں اس کی شادی اپنے بیٹے شہزادہ محمد اعظم سے کر دی قاضی القضات عبد الوہاب نے شاہی مسجد میں تمام شہزادے ،ارا کین سلطنت ،اور امراء کے سامنے نکاح پڑھایا اس موقعہ پر دعوت نہایت دھوم دھام سے کی گئی اس تقریب میں جہاں آرا نے سولہ لاکھ روپے اپنے خاص سے صرف کی تھی۔

جہاں آرا بڑی فاضل خاتون تھی اس کی تصنیف ''مونس الارواح'' نہایت معروف اور مشہور ہے، یہ کتاب دراصل اس اخلاص وعقیدت کا ثمرہ ہے جو جہاں آرا کو حضرت نظام الدین اولیاء سے تھی، جہاں آرا نے ۱۰۴۹ھ میں اس کتاب کو تصنیف کی تھی۔

جہاں آرا شعراء اور ارباب کمال کو انعام واکرام سے اکثر نوازتی رہتی تھی۔

ایک شاعر جس کا نام حاجی محمد خان قدسی ہے اس نے اس شہزادی کے جل جانے کے موقع پر ایک قصیدہ لکھا جس کا ایک شعر جہان آرا کو پسند آیا اور اس کے صلے میں پانچ ہزار روپیہ عطا کیا۔

ناسر زدہ از شمع چنیں بے ادبی پروانہ زعشق راسوختہ است

مرزا محمد علی ماہر نے ایک مثنوی اس شہزادی کی تعریف میں لکھی جس کا ایک شعر انہیں بہت پسند آیا اور اس شاعر کو پانچ سو روپیہ انعام میں دیا۔

بذات اوصفات کردگار است کہ خود پنہاں وفیضش آشکار است

جہاں آرا ، پوری زندگی زہد وتقوی سے اپنا سروکار رکھا اسکا مذہب اپنے بزرگانہ قدیم کے حنفی تھا اور تصوف سے اس کو خاص دلچسپی تھی اور حضرت خواجہ معین الدین چشتی سے دلی عقیدت رکھتی تھی اس نے ۱۰۹۲ھ میں بمقام دہلی انتقال کیا۔وفات کے وقت ان کی عمر ستّر سال کی تھی بادشاہ عالمگیرؒ اس وقت برہان پور میں تھا یہ سانحہ سن کر دیر تک رویا۔ جہاں آرا کے وفات کے وقت اس کے خزانے میں تین کڑور روپے تھے جس کیلئے اس نے وصیّت کی تھی کہ سب روپیہ خدام درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء میں تقسیم کر دئے جائیں کیونکہ انہیں کے ذریعہ سے جہاں آرا کو اس مقدس روضے میں دفن کیلئے جگہ ملی۔

زیب النساء۔ یہ اپنے زمانے کی ایک بہت بڑے پایہ کی عالمہ، فاضلہ اور شاعرہ خاتون تھی یہ اورنگ زیب عالم گیرؒ کی پہلی اولاد، دلرس بانو بیگم کے بطن سے تھی انکی مزاج میں سادگی بہت تھی اور زینت وتکلف کو کم دخل تھا کسی نے کنایتہً اس کو یہ نصیحت کی کہ بادشاہ کی اولاد کو شایان شان شاہنشی کر دفرد کا خیال رکھنا چاہیے اس نے نہایت بے اعتنائی کے ساتھ جواب دیا۔

دختر شاہم ولیکن رو بفرآوردہ ام زیب وزینت بس ہمنیم نام من زیب النسا است

زیب النسا کے استاد ملا محمد سعید اشرف مازندرانی کا اسم گرامی کتابوں میں درج ہے یہ ممتاز عالم، اور شاعر کے ساتھ ساتھ ایک بہترین خطاط، اور خوش نویس تھے زیب النسا نے شعر وشاعری کی اصلاح اپنے اسی استاد سے حاصل کی ''مخفی'' تخلص زیب النسا کا مشہور ہے مگر محققوں نے اس میں بھی اختلاف کیا ہے اس لیے کہ اس زمانے کی تاریخی کتابوں اور تذکروں میں اس تخلص کا ذکر نہیں ہے پروفیسر محفوظ الحق صاحب نے مرأت الخیال اور کلمات الشعرا اور منتخب اللباب کے بارے میں لکھا ہے کہ ان جیسے معتبر اور معاصر تذکرہ نگاروں نے اس کا ذکر نہیں کئے ہیں لیکن جدید تذکرہ نویس اور مؤلفین حیات زیب النسا اس بیگم کا تخلص ''مخفی'' اور اس کو دیوان مخفی کا مؤلف کہکر۔ بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را کے مصداق بن رہے ہیں۔ دیوان مخفی کے اشعار کے حوالے سے پروفیسر محفوظ الحق صاحب لکھتے ہیں کہ مخفی زیب النسا نہیں بلکہ کوئی اور ہے جو خراسان سے شاہجہاں کے عہد میں ہندوستان آیا جس کو قیامِ ہند کے دوران طرح طرح کی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا جس سے مجبور ہو کر وطن لوٹ جانے کا فیصلہ کیا جیسا کہ اس شعر سے واضح ہے

وجودِ بیوجودِ من بمن ہموارہ در جنگ است　　　　که مشت استخوانش را برم سوئ خراسانش

کہا جاتا ہے کہ زمانہ نے ان کا ساتھ نہ دیا اور وہ قید ہوگئے رہائی کے بعد وطن تو نہ جاسکے مگر بیت الحرم کا سفر کیا کیونکہ وہیں امان کی صورت ان کو نظر آئی چنانچہ ایک شعر میں رسول اکرم ﷺ کو مخاطب کر کے کہتا ہے۔

یا رسول عربی جذبۂ شوق، کہ چو ابر　　　　سالہا شد بہ تمنّائے درت گریانم

یہ تمنا مخفی کی پوری ہوئی اور زیارت کعبہ نصیب ہوئی جیسا کہ اس شعر سے واضح ہوتا ہے

از در حجرۂ تو تا بدرِ روضۂ خلد　　　　صف زدہ خیلِ ملک بہر شفاعت بنگر

اگر در گلشنِ عشرت ندارم راہ ای مخفی　　　　بحمد اللہ کہ بارے گوشۂ بیت الحرم دارم

اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ مخفی تخلص زیب النسا کی نہیں ہے

زیب النساء کو موسیقی کا شوق تھا جو اس شعر سے واضح ہوتا ہے۔

زموسیقی واز الحانش آگاہ　　　　بگوش استماعش لیک اکراہ

صاحب بزم تیموریہ نے مآثر عالم گیری کے حوالہ سے لکھا ہے کہ علماء فضلاء اور خوش نویسوں کا ایک گروہ زیب النساء بیگم کی سرکار سے فیض یاب ہوا کرتا تھا۔ اور مولانا شبلیؒ کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ زیب النسا کا دربار حقیقت میں ایک اکیڈمی تھی جس میں ہر فن کے عالم فاضل ملازم تھے جو تصنیف وتالیف کے کام میں مشغول رہتے تھے اس شہزادی نے جو کتابیں تصنیف کرائیں ان میں سب سے اہم ''تفسیر کبیر'' کا ترجمہ ہے اس تفسیر سے متعلق علامہ شبلیؒ لکھتے ہیں کہ ''یہ مسلّم ہے کہ تفسیروں میں امام رازی کی تفسیر سے زیادہ جامع کوئی تفسیر نہیں، اس لیے زیب النسا نے ملا صفی الدین کو جو کشمیر میں مقیم تھے حکم دیا کہ اس کا فارسی ترجمہ کریں جس کا نام زیب التفاسیر رکھا گیا'' (۶) لیکن اس تفسیر سے متعلق بعض دانشمند حضرات نے لکھا ہے کہ یہ زیب النسا کی ہی تصنیف ہے جو درست نہیں ہے۔ بہر حال اس شہزادی کو کتابیں جمع کرنے اور تصنف وتالیف کا بے حد شوق تھا جس کے لیے اس نے ایک کتب خانہ قائم کیا تھا۔ تاریخ سے تعلق رکھنے والے حضرات جانتے ہیں کہ اس بیگم نے عربی، فارسی علوم پر دسترس رکھنے کے ساتھ ساتھ نستعلیق، نسخ اور شکستہ خط لکھنے میں ماہر تھی لیکن ان کی کوئی تحریر موجود نہیں ہے۔

تاریخ کی شہادت ثبت کر رہی ہے کہ وہ رخ روشن جس پر آج یورپ نے بے اعتدالی کا غازہ مل دیا ہے گلستان اسلام کا ایک گل تر تھا اور وہ آواز جو یورپ کے طبقۂ نسواں سے ترقی، ترقی کی آرہی ہے وہ قدیم اسلامی ترقی کی آواز بازگشت ہے اور یہ شعر اس پر ثابت ہے۔

لے اڑی طرز فغاں بلبل نالاں ہم سے　　گل نے سیکھی روشن چاک گریباں ہم سے

حواشی

۱　بزمِ تیموریہ جلد سوم ص، ۲۲۱

۲ تاریخ ہند، ص۵۲۴

۳۔ معارف۔ جولائی ۱۹۵۸ء

۴۔ بزم تیموریہ جلد سوم۔ ص۲۲۶

۵۔ ایضاً۔ ص۲۲۷

۶۔ مقالات شبلی، جلد پنجم، ص۱۱۱۔

کتابیات

۱ تاریخ فرشتہ۔ محمد قاسم فرشتہ۔ ترجمہ عبدالحئی خواجہ ایم اے۔ مکتبہ ملت دیوبند یوپی

۲ تاریخ ہند، پروفیسر شیخ عبدالرشید، پی، سی، دوادش، شرینی اینڈ کمپنی پرائیویٹ لمٹیڈ علی گڑھ

۳ تاریخ ہند، صادق حسین، احسان بک ڈپو۔ لکھنؤ

۴ بزمِ تیموریہ جلد سوم، سیّد صباح الدین عبدالرحمٰن، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڈھ ۲۰۰۹ء

۵ مغلیہ سلطنت کا عروج وزوال، آر پی ترپاٹھی، مترجم ریاض احمد خاں شروانی۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی ۲۰۱۰ء

۶ خانوادۂ ملکۂ نور جہاں بیگم کی ادبی خدمات، ڈاکٹر محمد عثمان غنی۔ عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی

۷ ملکۂ نور جہاں کے سلسلۂ مادری و پدری کے اہم افراد۔ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب، معارف جولائی ۱۹۵۸ء

۸ گلبدن بیگم، پروفیسر سیّد ابن حسن صاحب شارق، قومی کتب خانہ دہلی مزیر جامع مسجد

۹ زیب النسا اور دیوانِ مخفی، پروفیسر محفوظ الحق، معارف نمبر ۵، جلد ۱۱

۱۰ زیب النسا، مقالات شبلیؒ جلد ۵

۱۱ زیب النسا، پروفیسر محفوظ الحق، شمع آگرہ ۱۹۲۵ء۔ بحوالہ بزم تیموریہ جلد سوم

☆☆☆

TASFIYAH

(An International refereed indexed research journal in urdu persian arabic & English)

Biannual Journal with ISSN: 2347-7938

Editor

Zunnoorain Haider Alavi

Address:

Kutubkahana-e-Anwariya

Khanqah-e-Kazmiya Qalandariya, Kakori, Lucknow-226101

Mob. no. +91-9307025800, Email: editor@tasfiyah.com/zunnoorain786@gmail.com

DABEER

(An International Peer Reviewed Refereed Research Journal in Urdu & English)

Quarterly Journal with ISSN: 2394-5567

Editor

Ahmad Naved Yasir Azlan Hyder

Address

Dabeer Hasan Memorial Liberary

12, Choudhri Mohalla Kakori Lucknow-226101

Mob. no. +91-9410478973, Email: dabeerpersian@rediffmail.com

IRFAN

(An Multilingual International Journal of Interdisciplinary Studies)

Quaterly Journal with ISSN: 2454-4043

Editor

Arman Ahmad

Irfan Educational Society

Chakdara, Olahanpur, Chapra (Bihar). 841415

Mob. no. +91-9918902257, Email: irfan.journal@outlook.com

ANWAR-E-TAHQEEQ

(Monthly multiligual & multidisciplinary magzine from Qila-e-Golconda, Hyderabad, Deccan)

Volume:-2, Issue:- 1, JANUARY 2016

Price: Monthly:-50rs., Annual:- 500rs.

Supervision

Syed Adil Ahmad, Department of Archaeology, state museum, Hyderabad Telangana

Editor

Syed Iliyas Ahmad Madni,

Address:-

9-10-389, Neem Bowli, Masjid, Kathora House, Golconda Fort, Hyderabad,

Telangana- 500 008

Mob:- 09966647580 Email:- anwaretahqeeq@gmail.com

Editorial Board

Dr. Shaid Naukhez Azmi, D/o,Persian,Manuu

Dr. Mohd. Aqeel, D/o, Persian, BHU

Dr. Sakina I Khan, HOD Persian, BU

Dr. Mohd. Qamar Alam, D/o, Persian, AMU

M. Tauseef Khan Kaker, D/o, Persian, AMU

Ahmad Naved Yasir Azlan Hyder

Editor, quaterly DABEER, Kakori, Lucknow

Arman Ahmad

Editor, quaterly Irfan, Chapra, Bihar

Atifa jamal

Editor Yearly Kokab-E-Naheed, Sandila

Sheikh Abdul Raheem, JIH, Hyderabad

Mutabbi Ali Khan, Daily Munsif, Hyderabad

Advisory Board

Prof. Shameem Akhtar, BHU, Varanasi

Prof. Masood Anwar Alavi, AMU, Aligarh

Prof. Umar Kamaluddin, LU, Lucknow

Prof. Syed Hasan Abbas, BHU, Varanasi

Prof. Azeez Bano, MANUU, Hyderabad

P. Anuradha Reddy, Intex, Telangana, Hyderabad

Dr. Zareena Perveen, Director of Archieves, Hyd.

Dr. S. M. Asghar Abidi, AMU, Aligarh

Ahmad Ali, Keeper Manuscript, Salarjung, Hyd.

Dr. S. Asmath Jahan, MANUU, Hyderabad

Dr. M. A. Naeem, Hyderabad

M.A. Ghaffar, caleographer, AIwan-e-Urdu, Hyd.

Kishore Jhunjhunwala, Expert of coins, Mumbai

Amarbeer Singh, Expert of coins, Hyderabad